اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۶

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

مولانا عبدالحلیم شرر، محمد ہادی رُسوا
اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے
حالاتِ زندگی اور اُن کی
نثرنگاری پر ایک مستند کتاب

مؤلف:
اے حمید

۱۶
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اُردو نثر کا ایک مستند، تاریخی و ادبی سلسلہ

اُردو نثر کی داستان

مؤلف:

اے حمید

۱۶
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیرِ مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - اشتیاق احمد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
اُدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور
فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

مولانا عبدالحلیم شررؔ سے مرزا فرحت اللہ بیگ تک

"اُردو نثر کی داستان" قسط ۱۶ مولانا عبدالحلیم شررؔ، محمد ہادی رسواؔ اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی پر محیط ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، اس سلسلے کے مؤلف جناب اے حمید ہیں جو ایک لگن اور یکسوئی سے یہ اقساط آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ ان کی یہ اُدبی کاوش لائقِ تحسین ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں سب سے پہلے آپ مولانا عبدالحلیم شررؔ کی زندگی سے روشناس ہوں گے۔ انھیں سر سید احمد خان جیسے عظیم آدمی کی صحبت نصیب ہوئی اور اسی صحبت نے ان کے اُدبی ذوق کو چار چاند لگائے۔ پہلے پہل اُنھوں نے تصنیف و تالیف کا کام کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، یہاں تک کہ ناول نویسی کی طرف راغب ہوئے۔ اُردو اَدب میں ناول نگاری کی ابتدا مولانا نذیر احمد دہلوی سے ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے اسلامی تاریخ کو زیادہ اہمیت دی اور سے ناول نگاری کے قالب میں ڈھالنے کے کامیاب تجربات کیے۔ آپ نے "فردوسِ بریں" جیسے شاہکار ناول لکھے۔ اس کتاب میں آپ فردوسِ بریں سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔

مرزا محمد ہادی رُسواؔ نے شہرت کی بلندیوں کو اپنے ناول — "امراؤ جان اَدا" کے طفیل چھوا، مرزا رُسواؔ اپنے ناول کے پلاٹ اور کردار روزمرہ زندگی سے لیتے ہیں، فطرتِ انسانی پر ان کی گہری نظر ہے، واقعات کی تصویر کھینچنے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ نثر نگار کے ساتھ ساتھ وہ شاعر بھی تھے۔ ان کی مشہورِ زمانہ تصنیف اُمراؤ جان اَدا سے بھی حظ اُٹھائیے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے زمانے کے مزاح نگار تھے۔ مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ زبان اور محاورے کے بھی دھنی تھے۔ روانی، الفاظ پر گرفت، مضمون اور خیال کا دست و گریباں ہونا مرزا فرحت اللہ بیگ کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کے شہرۂ آفاق مضامین کے اقتباسات آپ کے لیے یقیناً تفننِ طبع کا کام دیں گے۔

ہمیں اُمید ہے کہ اُردو نثر کے اس مقبولِ عام سلسلے کی یہ قسط آپ کے ذوقِ سلیم پر پُوری اترے گی۔

عبدالحلیم شرر حالات زندگی

عبدالحلیم شرر کے والد حکیم تفضل حسین کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔ وہ اودھ کے جلاوطن بادشاہ واجد علی شاہ کی سرکار میں ملازم تھے اور جلاوطنی میں ان کے ساتھ ہی لکھنؤ سے ترک سکونت کرکے کلکتہ آگئے تھے۔ شرر لکھنؤ میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں شرر کے والد حکیم تفضل حسین لکھنؤ میں ہی تھے۔ چنانچہ شرر کو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ لیکن وہ زیادہ جی لگا کر نہ پڑھ سکے۔ چنانچہ حکیم صاحب نے انہیں کلکتے بلالیا۔ یہاں انہیں علمی اور ادبی صحبتیں میسر آئیں۔ کلکتے میں رہ کر شرر نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور عربی اور فارسی زبانیں بھی سیکھ لیں۔ دس بارہ برس کے بعد شرر واپس اپنے وطن لکھنؤ آگئے اور یہاں بھی اپنے تعلیمی مشاغل جاری رکھے۔ بھرپور جوانی کی عمر میں شرر نے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ مقصد مزید تعلیم حاصل کرنا تھا۔ یہاں ان کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی تو توسن ادب کو مہمیز لگی۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا اور سب سے پہلے ایک عربی رسالے "توحید" کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ واپس آکر "اودھ اخبار" میں نوکری کرلی اس اخبار میں وہ مضامین بھی لکھتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ سے ہی شرر نے اپنا ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام "دلگداز" تھا۔ اس رسالے میں انہوں نے سب سے پہلی بار اپنے ناول کو قسط وار پیش کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ملک عزیز ورجنا، حسن انجلینا اور منصور موہنا قسط وار اس رسالے میں شائع ہوئے۔ اس کے باوجود یہ رسالہ انہیں مالی اعتبار سے مطمئن نہ کرسکا اور تلاش سکون کے لیے انہیں حیدرآباد کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ حیدرآباد آکر انہوں نے سندھ کی تاریخ لکھی۔ یہاں نواب وقار الامراء نے شرر کی بڑی قدر افزائی کی اور انہیں اپنے فرزند کے ساتھ لندن بھجوادیا۔ انگلستان میں شرر تین برس تک رہے یہاں انہوں نے فرانسیسی زبان پر بھی عبور حاصل کرلیا۔ شرر نے ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

شرر کا فن

بقول اویس احمد ادیب۔ "اردو ادب میں ناول نگاری کی ابتداء مولانا نذیر احمد دہلوی نے کی اور انہوں نے روزمرہ زندگی کے واقعات کو اس انداز میں بیان کیا کہ قدیم افسانوں اور جدید ناولوں میں ایک زبردست فرق محسوس ہونے لگا۔ یعنی انہوں نے ہوائی باتیں اور طلسم بندی سے اپنے ناولوں کا محل تعمیر نہیں کیا۔ جب ان کے ناول قدردانان ادب نے ہاتھوں ہاتھ لیے تو اس عہد کے اور اہل قلم حضرات نے بھی اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ سرشار اور شرر نے اس میدان میں اپنے راہوار قلم ڈال دیئے۔ سرشار نے نذیر احمد کے طرز کو لے کر قدیم طرز سے ملا دیا اور ایک ایسا مرکب تیار کیا جو دونوں اسالیب کی خصوصیات کا حامل تھا۔ مگر عبدالحلیم شرر نے ان دونوں اسالیب کے علاوہ اپنے طرز تحریر اور اسلوب بیان میں انگریزی زبان کے اثرات کو کام کرنے کا پورا پورا موقع دیا۔ بعض نقادان ادب کا تو خیال ہے کہ مولانا شرر نے انگریزی ناول نگار اسکاٹ اور رینالڈس کے ناولوں اور ان کے اقوال کو ہو بہو نقل کر دیا ہے اور انگریزی اصول ناول نویسی کو اور ناول نگار کے فرائض کو بخوبی انجام دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ انہوں نے صرف دو چار ہی ناول نہیں لکھے بلکہ اس کثرت سے لکھے گئے ہیں کہ ان کے نام یاد رکھنا مشکل ہے۔"

یہ اویس احمد صاحب کا ذاتی خیال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بعد کے کسی بھی نقاد نے ان سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ شرر نے اسلوب بیان اور کردار نگاری میں والٹر اسکاٹ کے ناولوں سے تاثر لیا ہو۔ لیکن یہ کہہ دینا کہ شرر نے فرانسیسی ناول نگاروں کے اقوال کو ہو بہو نقل کر دیا یا ان کی ناول نویسی کو سامنے رکھ کر اپنے ناول لکھے بجا نہیں ہے ـــــ اسی ضمن میں ممتاز نقاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین اپنے خیال کو یوں اظہار میں لاتے ہیں ـــ "شرر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ دی اور ناول نگاری کے فن کو اردو میں ترقی دینے کی کامیاب کوشش کی۔ انہوں نے اس فن میں متانت اور سنجیدگی قائم کر کے ابتذال اور ہرزہ گوئی سے ناول نگاری کو بچا لیا۔ اسلامی تاریخ عربی اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بھولی جاتی تھی۔ شرر نے از سر نو اپنے ناولوں کی وجہ سے پھر دنیا کے سامنے زندہ کر کے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے اسلاف کے کارنامے نظروں کے سامنے آگئے۔ دلوں میں ایک جوش پیدا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے جوش عقیدت کے ساتھ ساتھ خاص خاص اسلامی مقام اور اشخاص کو نہایت بلند کر کے دکھایا۔ ان کا طرز بیان شگفتہ اور رواں ہے۔ اگرچہ تخیل میں زیادہ گہرائی نہیں۔ ناولوں کے علاوہ شرر نے کثرت سے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے جو مختلف مجموعوں کی صورت میں چھپ کر سامنے آئے۔"

فردوس بریں پر ایک نظر

"فردوس بریں" مولانا شرر کا بلاشبہ ایک عظیم شاہکار ہے۔ یہ ایک لیوگری قسم کا ناول ہے۔ یہاں شرر نے مذہبی اور تاریخی واقعات کو لے کر سماجی اور فرضی واقعات کی مدد سے ناول کا تانا بانا بنا ہے۔ اس کے باوجود واقعات کی حقیقت میں ذرا سا بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یہ ناول ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے جیسا کہ شرر کے اکثر ناول اسی ضمن میں لکھے گئے ہیں۔ بقول اویس احمد ادیب ـــ "شرر کا یہ شاہکار ہر انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ چند ساعت کے لیے زمانہ حال اور اپنے ماحول کو فراموش کر کے اور دنیا کی تمام فکروں سے آزاد ہو کر اپنے ذہنی اور روحانی رجحانات کو زمانہ ماضی کی طرف لے جائے اور اس عہد قدیم کی یاد پھر اپنے دل میں تازہ کرے جس کو ایک عرصہ ہوا وہ بھول چکا ہے۔ چنانچہ فردوس بریں کی ابتداء ہی میں مولانا نے اپنے اس مقصد کو بخوبی نمایاں کر دیا ہے۔ اس ناول کی تمہید ہر انسان کو بتلا دیتی ہے کہ ان کے عہد کی داستان نہیں۔ بلکہ وہ اس زمانہ کی داستان کا ایک ورق ہے۔ جس کو عہد قدیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس وقت محمد غوری اور قطب الدین ایبک اپنی فتوحات کا پھریرا شمالی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شرر نے اس قصے کو ایران سے لیا۔ اس ناول میں شرر نے ساتویں صدی ہجری کے قرامطہ فرقے کا رعب و دبدبہ، ان کے درباروں کی سازشوں اور زندگیوں کا حال بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔"

فردوس بریں میں سے

ملاءِ اعلیٰ کا سفر

امام نجم الدین نیشاپوری اس عہد کے بہت بڑے امام تھے۔ تمام زمانے میں ان کی نیک نفسی اور ان کے علم وفضل کی شہرت تھی اور شاید کوئی مقام نہ ہو گا۔ جہاں ان کے شاگرد مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی مقتدائی نہ کر رہے ہوں۔

حسین کے وہ استاد و مرشد ہی نہیں بلکہ چچا بھی تھے۔ ان کا اصلی وطن شہر آمل میں تھا۔ مگر کم عمری ہی میں طالب علم کے شوق میں گھر سے نکل گئے تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی درسگاہوں میں شریک ہو کے بغداد پہنچے۔ ایک مدت دراز تک مدرسہ نظامیہ کی

طالب علمی کی ۔ پھر مشرقی بلاد علم کی سیاحت میں مشغول ہوئے بخارا اور ہرات کی علمی صحبتوں میں شریک ہوئے اور وہاں کے علماء کی درسگاہوں سے خوشہ چینی کر کے نیشاپور میں آئے اور وہیں متوطن ہو گئے ۔ اب ان دنوں وہ علم و فضل کے بڑے مرکز اور خداشناسی کے نامور قطب بنے ہوئے تھے ۔ حسین نے ایک ایسے نیک نفس اور باخدا عزیز کے قتل کرنے کا حکم سنا ۔ تو یکایک کچھ ایسی حیرت و پریشانی غالب ہوئی کہ بے ہوش ہو گیا ۔ شیخ علی وجودی نے اس کے ہوش میں لانے کی کوئی تدبیر نہ کی ۔ بلکہ اسی طرح زمین پر پڑا رہنے دیا ۔ تھوڑی دیر تک تو وہ انتظار کرتے رہے کہ حسین خود ہی ہوش میں آ کے حکم بجا لانے کا وعدہ کرے مگر جب اسے ہوش آنے میں دیر ہوئی ۔ تو اسی طرح چھوڑ کے ایک دوسرے حجرے میں چلے گئے ۔

شاید دو گھنٹوں کے بعد حسین کو ہوش آیا اور اس کے ساتھ ہی شیخ کا واجب التکمیل حکم بھی یاد آیا ۔ قریب تھا کہ دریائے غفلت میں پھر ایک غوطہ لگائے مگر سنبھلا اور اٹھ کے چاروں طرف دیکھا ۔ شیخ علی وجودی غائب تھے اور تنہا وہی وہ تھا ۔ گذشتہ باتوں کو یاد کر کے حیرت کرنے لگا ۔ کیا مجھے شیخ کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ؟ بے شک ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ایسے نیک نفس اور حقیقت بین شیخ نے تو اس قسم کے سخت ظلم و گناہ کا حکم نہ دیا ہو گا ۔ مجھے قتل عمد کی ہدایت اور قتل بھی کس کا ؟ شیخ نجم الدین نیشاپوری کا ۔ جن سے بڑا عالم و فاضل اس وقت سطح ہستی پر نہیں ۔ یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی ۔ مگر فرض کیا جائے کہ شیخ نے یہی حکم دیا ہے ۔ تو کیا یہ مجھ سے ہو سکے گا ۔ کہ اپنے استاد ، مرشد اور باخدا چچا کو قتل کر ڈالوں ۔ (کانپ کر) بہت مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ دنیا کیا کہے گی ؟ اور پھر دین میں بھی تو ہے کہ " من قتل مؤمناً متعمداً فقد کفر "

اس حکم کو بجا لانے کے سوا اس کے کہ رو سیاہی دارین حاصل کروں اور کوئی فائدہ نہیں نظر آتا ۔ بس " خسر الدنیا والآخرۃ " کے سوا اور کچھ نہیں ۔ لیکن ہاں شیخ نے کہا تھا ۔ کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے ۔ اس میں بھی کوئی فائدہ ضرور متصور ہو گا ۔ حقیقت بینی اور رموز قدرت جاننے میں امام نجم الدین شیخ علی وجودی کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ اور نہ یہ خیال میں آ سکے ہے کہ شیخ علی وجودی کی نیت بری ہے ۔ کوئی تعجب نہیں اگر کسی روحانی مصلحت سے انہوں نے بظاہر ایسے مکروہ کام کا حکم دے دیا ہو ۔ واقعی اگر یہی حکم ہوا ہے ۔ تو مجھے تامل نہ کرنا چاہیئے ۔ یہ میرا پہلا امتحان ہے ۔ اگر ذرہ بھی عذر کیا ۔ تو گنہگار بھی ہوں گا اور زمرد کے وصال سے بھی محروم رہوں گا ۔ اس تعمیل حکم میں دینی فائدہ تو بدیہی ہے ۔ کیونکہ شیخ کا امر واجب الاذعان ہے ۔ باقی رہی دنیاوی بدنامی ۔ اول تو اس کی کوئی ہستی نہیں ۔ اور اگر کسی قدر ہے بھی تو اس کے عوض میں یہ کتنا بڑا فائدہ ہے ۔ کہ پیاری زمرد کی ہم کناری ایسی زندگی میں نصیب ہو جائے گی ۔ بے شک مجھے کسی قسم کا عذر نہ کرنا چاہیئے ۔

دل میں یہ خیالات جما کے حسین حجرے سے نکلا اور مختلف حجروں میں ڈھونڈتا ہوا اس حجرے میں پہنچا ۔ جس میں شیخ علی وجودی تھے ان کی صورت دیکھتے ہی قدموں پر سر رکھ دیا اور چلایا " مجھے وہ حکم نہیں یاد رہا ۔ جلدی بتایئے کہ تعمیل کو روانہ ہوں "

شیخ ۔ دیکھو تمہیں اب کی تامل نہ ہو ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دل میں بدگمانی پیدا ہو ۔ اور تم اپنی ساری محنت ضائع کر دو ۔ خوب یاد رکھو ۔ کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے ۔

حسین : ۔ خوب یاد ہے ۔ اور مجھے ذرا تامل نہ ہو گا ۔

شیخ : ۔ تو جاؤ امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر دو ۔

حسین : ۔ (دل کو مضبوط کر کے) بہتر ۔ لیکن اگر میں مار ڈالا گیا ۔

شیخ : ۔ کوئی مضائقہ نہیں ۔ بلا زحمت زمرد سے جا ملو گے ۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہ ہو سکے گا ۔

حسین : ۔ تو میں رخصت ہوتا ہوں ۔

شیخ : ۔ ٹھہرو ۔ (ایک تیز خنجر نکال کے) لو ! اس خنجر کو اپنے پاس چھپا کے رکھو ۔ اور جس وقت موقع ملے ۔ اسی سے کام لینا وہ مرشد کا عطا کیا ہوا خنجر لے کے حسین نے اپنے استاد کی جان لینے کے لیے مشرق کی راہ لی ۔ ڈیڑھ مہینے بعد بغداد پہنچا ۔ وہاں سے چل کے اصفہان اور اصفہان سے ایک مہینے بعد نیشاپور پہنچ گیا ۔ حلب سے نکلے چار مہینے ہوتے تھے ۔ کہ وہ امام نجم الدین کی درسگاہ میں حاضر ہو گیا ۔ امام موصوف پہچانتے ہی بغل گیر ہوتے اور بے انتہا شفقت سے پیش آئے ۔

گھر کے خطوط سے انہیں یہ خبر معلوم ہو چکی تھی کہ حسین ایک شریف لڑکی کو ساتھ لے کے بدنامی کے ساتھ نکل گیا جس کا تذکرہ کر کے انہوں نے افسوس کیا اور کہا حسین ! مجھے ایسی امید نہ تھی کہ علم کو اس ذوق و شوق سے حاصل کر کے تم اس کی بے حرمتی کرو گے ۔

حسین : ۔ یا عم ! میں کسی بری نیت سے نہیں گیا تھا ۔ زمرد کا عقد میرے ہی ساتھ ہونے والا تھا ۔ اور وہ حج کی بے انتہا مشتاق تھی ۔ اسی علم دین کی وجہ سے مجھے نہ گوارا ہوا ۔ کہ اس کی اس دینی خواہش کا لحاظ نہ کروں ۔ بے تامل ساتھ لے کے چل کھڑا ہوا ۔

امام : ۔ اور اب وہ کہاں ہے ؟

حسین : ۔ جبال طالقان کی گھاٹیوں میں پریوں کے ہاتھ سے مار ڈالی گئی ۔

امام : ۔ (مسکرا کر) ایسا مہمل و بے سروپا قصہ بنانے سے کیا حاصل ۔ جسے کوئی تسلیم ہی نہ کرے گا ۔

حسین : ۔ جس بے تکلفی سے میں نے یہ قصہ بیان کر دیا ہے ۔ اسی سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں ۔ کہ میرے بیان میں کسی بناوٹ کو دخل نہیں ۔

امام : ۔ خیر اب یہاں کس غرض سے آئے ہو ۔

حسین : ۔ آپ کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کے لیے ۔ زمرد کے غم میں میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ علائق دنیوی کو چھوڑ دوں ۔ اور چاہتا ہوں ۔ کہ یہ باقیماندہ زندگی تحصیل علم پر ہی صرف ہو جائے ۔

امام : ۔ اگر ایسا ہے ۔ تو خدا تمہارے ارادے میں برکت دے اور تمہیں توفیق ہو ۔ کہ میرے بعد اس درسگاہ کے مالک ہو ۔

الغرض حسین امام نجم الدین کے خوشہ چینیوں میں شامل ہو گیا اور چونکہ بھتیجا تھا ۔ ان کے دل میں روز بروز اپنا زیادہ اعتبار پیدا کرتا گیا ۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنا موقع بھی ڈھونڈ رہا تھا ۔ امام اکثر اوقات طلبہ اور معتقدین کے مجمع میں رہتے جس کی وجہ سے تین مہینے گزر گئے اور حسین کو خنجر نکالنے کا موقع نہ ملا ۔ چوتھے مہینے میں چھوی دن گزرے تھے کہ اتفاقاً امام کو شدت سے بخار آیا ۔ اور کئی دن تک درس و تدریس کا سلسلہ موقوف رہا ۔ اس بے کاری کے زمانے میں اکثر طلبہ تو ادھر ادھر سیر کو رہتے مگر

حسین نے شیخ کی تیمارداری میں انتہا سے زیادہ گرم جوشی اور سعادت مندی دکھائی۔ شب و روز ان کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں مصروف رہتا۔

امام کو بخار آتے چھٹا روز تھا۔ کہ ایک رات کو اتفاقاً ان کے حجرے میں اکیلا حسین ہی تھا۔ رات زیادہ آچکی تھی اور امام بچھونے پر لیٹے ناتوانی کی آواز میں اس سے باتیں کر رہے تھے۔ حسین خلاف معمول آج زیادہ خاموش تھا۔ ان کی باتوں پر ہنکاری کو ضرور بھرتا جاتا تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی اور لفظ اس کی زبان سے نہ نکلتا تھا۔ کئی مرتبہ امام کو تعجب بھی ہوا۔ بلکہ ایک مرتبہ پوچھنے لگے۔ حسین آج تم خاموش کیوں ہو؟ مگر حسین نے یوں ہی کہہ کے ٹال دیا۔ حسین ساکت تھا اور بار بار باہر نکل کے تاروں سے دریافت کرتا تھا۔ کہ رات کتنی آئی۔ آخر آدھی رات گزر گئی اور حسین کو اطمینان ہو گیا۔ کہ اب صبح تک کوئی نہ آئے گا۔ اس بات کا یقین کر کے اس نے حجرے کا دروازہ خوب مضبوطی سے بند کر لیا۔ اور پاس جا کے دیکھا۔ تو امام کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ دیر تک کھڑا ان کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترتا آتا تھا۔ اور ساعت بہ ساعت اپنے استاد اور بزرگ پر کاری وار کرنے کے لیے زیادہ تیار ہوتا جاتا تھا۔ اس قسم کے خون ریز کاموں سے وہ کبھی آشنا نہ تھا۔ دل کو زور دے دے کر ابھارتا تھا۔ مگر خیالات ایسا پلٹا کھاتے۔ کہ بار بار ہمت ہار دیتا۔ حجرے میں ہر طرف سے اسے ایسی خیالی صورتیں نظر آتیں۔ اور ان کا ایسا رعب پڑتا تھا کہ معلوم ہوتا۔ جیسے فرشتے یا کسی اور قسم کی غیر جسمانی مخلوق امام کی حفاظت کر رہی ہے۔ خود امام کا چہرہ اس کے خیال کی آنکھوں میں کبھی نہایت ہی نورانی بن کے سفارش کرتا۔ اور کبھی بھیانک اور مہیب نظر آ کے ڈرا دیتا۔ مگر ان سب خیالات کو اس نے ہٹایا۔ شیخ علی وجودی کا عطا کیا ہوا خنجر نکال کے اس کی باڑھ دیکھی۔ اور یکایک دل مضبوط کر کے امام کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ امام نے چونک کے آنکھ کھولی ہی تھی۔ اور چلانے کو ہی تھے کہ اس کا بایاں ہاتھ ان کے منہ پر اور خنجر ان کے دل میں تھا۔ چند ہی لمحے میں امام کی روح پرواز کر گئی۔ خون تمام حجرے میں پھیلا ہوا تھا۔ بےجان لاش خون آلود کپڑوں میں لپٹی بستر پر پڑی تھی۔ اور گو یہ کوئی زور آوری کا کام نہ تھا۔ مگر حسین کے دل کو اتنی بڑی شدید حرکت ہوئی تھی۔ کہ کھڑا ہانپ رہا تھا اور بار بار اپنے ہاتھ کے معصوم شہید کی مظلومانہ صورت کو ڈر ڈر کے دیکھتا۔ آخر حسین نے ان سب چیزوں کو اسی حال میں چھوڑا۔ حجرے کے خوفناک سین پر سہمی ہوئی آنکھوں سے آخری نظر ڈالی اور دروازہ کھول کے نکلا۔

حجرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور چپکے چپکے قدم اٹھاتا ہوا چلا۔ شاید زیادہ وقت نہ صرف ہوا ہو گا کہ وہ شیخ کی خانقاہ سے دور نکل گیا۔

نیشاپور کے گرد نہایت ہی مضبوط فصیل تھی اور پھاٹک رات کو بند ہو جاتے تھے۔ جس کے سبب سے اس وقت اسے شہر سے باہر نکلنے میں بہت دشواری نظر آئی مگر وہ جان پر کھیل کے ایک تیرہ و تار بدررو کے ذریعے سے باہر نکلا اور نکلتے ہی نہایت تیزی سے بھاگا۔ تاکہ صبح ہونے سے پہلے ہی اتنی دور نکل جائے کہ کوئی اسے نہ پا سکے۔

دوسرے دن جب وہ مشرق کے پردوں سے اڑتا ہوا خراسان کے مغربی میدان اور جنگل قطع کرتا چلا جاتا تھا۔ اس وقت اس کے حواس ذرا ٹھکانے ہوئے اور اپنا ظلم و گناہ یاد آیا۔ جو ہر پہلو سے برا نظر آتا تھا۔ اس خیال کے ہٹانے کی برابر کوشش کرتا تھا مگر بار بار زبان سے ایک آہ کے ساتھ یہ جملہ نکل ہی جاتا تھا۔ کہ میں بڑا گنہگار ہوں“

اس کا دل اور اس کا ایمان اس پر لعنت کر رہا تھا۔ لعنت اور پھٹکار کی آواز کان میں آتی تھی۔ اور وہ چونک چونک کے کہتا کہ اس ”فعل کے ذمہ دار شیخ علی وجودی ہیں“۔ مگر خود ہی دل میں قائل ہو جاتا۔ کہ امام کا کام تو میرے ہاتھ اور میری سنگدلی نے تمام کیا ہے۔ ذمہ داری کسی اور کے سر کیوں کر جا سکتی ہے اب اس کے دل نے شیخ کے اس اصول میں بھی شک پیدا کیا کہ مرید مرشد کے ہاتھ میں صرف ایک بے جان اور غیر ذمہ دار آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہنے لگا۔

”انیس علمائے روحانیین کا یہ مسئلہ اگر صحیح ہے کہ ثواب اور عقاب اسی لذت و الم کا نام ہے۔ جو اپنے کردار کے نتائج میں خود اپنے کانشیس (conscience) اور دل کی تحسین و ملامت سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو انسان کے فعل کا کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو۔ کہ میں نے ایک کام کیا ہے اور گو وہ کسی مرشد و صلاح کار کے خیال میں اچھا ہو۔ مگر میرے نزدیک برا اور قابل ملامت ہے۔ تو اس کے ارتکاب پر میرا دل مجھ پر ضرور لعنت کرے گا اور جب اسی لعنت کے الم کو اصطلاح شرع میں عذاب سے تعبیر کیا ہے تو بیشک میں دوزخ اور عذاب سے نہ بچ سکوں گا۔“

الغرض خود حسین کے دل نے اسے قائل کیا۔ اب وہ پچھتا رہا ہے اور سخت روحانی تکلیف میں مبتلا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شیخ علی وجودی کی وقعت بھی ویسی ہی دل میں موجود ہے۔ شیخ کی وہ ایسی ایسی کرامتیں دیکھ چکا ہے کہ ان پر بدگمانی نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض اوقات ڈر جاتا ہے کہ شیخ غیب کے اور دلوں کے حالات سے واقف ہیں میرے یہ شکوک کہیں ان کو معلوم ہو گئے۔ تو غضب ہو جائے گا۔ ادھر سے بھی جاؤں گا اور ادھر سے بھی۔ اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب کے بعد بھی زمرد کے وصال سے محروم رہا۔ تو حسرت ہی رہ جائے گی۔

حسین اسی قسم کے خیالات دل میں لیے ندامت کے دریا میں غرق اپنے فعل پر پچھتاتا ہوا شہر حلب میں داخل ہوا۔ اور شیخ کے سامنے جاتے ہی قدموں پر گرتے کو تھا کہ انہوں نے اٹھا کے گلے سے لگایا اور نہایت ہی جوش سے کہا۔ حسین! تو اپنے امتحان میں پورا اترا۔ اور اب زمرد تجھ سے زیادہ تیری مشتاق ہے۔ اس نور لانور کے انوار ازلی نے تیرے دل پر پورا انعکاس کیا اور تیرے جسم کی اس مشت خاک نے یہ صلاحیت پیدا کر لی کہ اس عالم نور اور سرد شبستان کی تجلیات کی متحمل ہو سکے۔

حسین: ۔ مگر یا حضرت! میرے دل میں اپنے اس ظالمانہ فعل کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں؟

شیخ: ۔ (جوش میں آکر) بے شک پیدا ہوتے ہوں گے۔ روح اس مادے کی کثافت سے بڑی دشواریوں سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔ اور صرف یہی چیز ہے۔ جو ان شکوک و شبہات کو پیدا کرتی ہے۔ وہ مرکز اشراقی جو باوجود لاجی ہونے کے حیات ابدی کا چشمہ ہے۔ اس جسمانی روح پر جو قفس عنصری میں مقید ہے۔ اپنے تنوعات کو بمشکل آشکارا کر سکتا ہے۔

حسین: ۔ مگر ایسے اطمینان بخش نصائح ارشاد ہوں کہ دل سے یہ شبہات نکل جائیں۔

شیخ: ۔ سن اے حسین! استقلال تیرے شکوک کو دور کر دے گا بشرطیکہ تو ان کے دفع کرنے کی کوشش میں مشغول رہے مگر تیرے اطمینان کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں تکمیل نفس اسی کا نام ہے اور یہی منشاء الہیات کہ روح کے تعلقات اس جسم سے علیحدہ کیے جائیں۔ جسمانی افعال پر تصرف کرتے کرتے روح حاوی ہو جاتی ہے۔ بلکہ بلا استعانت مادہ کوئی کام نہ کر سکے اور وہ روحیں جو جسم کے چھوڑتے

وقت بلکہ انہیں مادیات میں مقیّد رہ گئیں۔ وہ بعد میں بھی ہر وقت اپنے گرد مادے کا تیرہ و تار غبار پاتی ہیں اور یہی چیز اصلاح شرع میں ان کا دوزخ ہے۔ نجات کی کوشش یوں ہونی چاہیے کہ زندگی ہی میں روح کے علائق جسم سے کم کر دیے جائیں۔ اس کوشش کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ جسم سے ایسے کام لیے جائیں جس سے روح کو تعلق نہ ہو۔ روح بیتاب ہو ہو کے ان کی طرف متوجہ ہونا چاہے۔ اور انسان بہادری اور مضبوطی سے اسے جبراً روکے۔ یہی الٰہیات کی تعلیم اوّلی ہے دوسری یعنی تعلیم وسطیٰ یہ ہے کہ روح ایسے کام کرے۔ جن سے جسم کو تعلق نہ ہو۔ جو لوگ دور دراز شہروں میں اپنی روح سے اثر ڈال دیا کرتے ہیں۔ ان کی نسبت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عالم روحانیت کے اس درمیانی درجے کو طے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا اور جزیہ یہ ہے کہ روح جسم سے اتنی علیحدگی حاصل کر لے کہ اس نور لانور کے انکشافات کی جستجو میں مادے سے مجرد و منزہ ہو کے ملکوت اور عالم لاہوت کی سیر کرے اور اس تیسرے درجے یا اس اعلیٰ جستجو کے زمانے میں جو کوئی مر جاتا ہے۔ تو جسم خاکی کو الوداع کہتے ہی اس نقطۂ اولیٰ یا ذات واجب الوجود اور علت العلل سے جا ملتا ہے۔ اس وقت اسے وہ اعلیٰ کمال روحانی حاصل ہوتا ہے۔ جس کی تحصیل کے لیے اس نے عالم مادی کی یہ قید اٹھائی تھی اور اس خاکستان کے مصائب میں مبتلا ہوا تھا اب اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو تعلقات جسدی کی مادی قیدوں سے اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جب چاہے اہل عالم کے سامنے اپنے آپ کو متجسّد و متشکّل کر کے دکھا دے اور دوسری طرف اس میں کمال روحانیت و تجرد اس درجے کا ہوتا ہے کہ جب چاہے اس نقطۂ ازل اور اولیٰ مرکز نور لانور سے جا ملے۔ لہٰذا اے حسین! تو اس مدرسۂ روحانیت کی ابتدائی جماعت میں ہے اور ابھی اسی امر کی مشق کر رہا ہے کہ تیرے ارکان جوارح سے ایسے افعال و حرکات صادر ہوں جن کی طرف روح بے صبری سے متوجہ ہو اور تو اسے زبردستیاں اور نفس کشیاں کر کے دوسری طرف منسوب کرے یہ لعنت و ملامت جو تیرا نفس اور تیری روح تجھ پر کر رہی ہے۔ اسی تعلق روحی کا نام ہے جن کے قطع کرنے کی تجھے کوشش کرنی چاہیے اور جب تو یہ کمال حاصل کرے گا کہ روح کو تیرے اعضا کے کسی فعل کی طرف توجہ تک نہ ہو۔ اس وقت تو دوسرے درجہ توحید میں قدم رکھے گا۔

حسین:- تو میں ان الزاموں اور ملامتوں کی پروا نہ کروں جو خود میرے دل سے مجھ پر پڑ رہی ہیں؟

شیخ:- ہرگز نہیں، اسی امر کی تجھے مشق کرنا ہے اور اس نور لانور کی طرف توجہ کرنے کا یہی پہلا زینہ ہے۔

حسین:- حضرات! آپ اس خداوند جل و علا کو نور لانور کیوں فرماتے ہیں؟ اس کی رمز میں نہیں سمجھ سکا۔ وہ حضرت رب العزت بے شک نور ہے۔ مگر لانور کیوں؟

شیخ:- (برہم ہو کے) وہ نقطۂ وحدت اور وہ سرچشمۂ تکوین اس سے بالکل منزہ ہے کہ ہم اپنے ادنیٰ خیال کے صفات کو اس کی جانب منسوب کریں۔ وہ ایسا ہے کہ "لیس کمثلہ شیء"۔

حسین:- مگر جب خود اللہ جل شانہ ہی نے ان صفات کو اپنی طرف منسوب کر لیا تو انہیں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ شیخ علی وجودی کی برہمی کی اب کوئی انتہا نہ تھی انہوں نے حسین کو غضب آلود اور آتش بار آنکھوں سے گھور کے دیکھا اور بولے "بے شک انسان ظلوم و جہول ہے! یہ تیرے خیال میں نہیں آتا کہ ہم بھی محض اسی کے ارشاد کے بموجب ان صفات کو اس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہم اسے نور کہتے ہیں مگر چونکہ ہمارے خیال کے نور سے وہ منزہ ہے لہٰذا پھر اسے لانور بھی کہہ دیتے ہیں۔

حسین:- بے شک یہی ہے؟ اب میرا اطمینان ہو گیا! اور ان شاء اللہ کبھی اپنے افعال پر نہ پچھتاؤں گا۔ لیکن امیدوار ہوں کہ اب مجھے وہ سرد ستان دکھا دیا جائے جہاں میری زمرد ان اجرام فلکی کے پہلو میں بیٹھی جلوہ افگنی کر رہی ہے۔

شیخ:- بہتر۔

یہ کہہ کے شیخ نے اٹھ کے اپنا کتابوں کا صندوق کھولا اس میں سے ایک چھوٹی کتاب نکالی، پھر اس کے ورق الٹ کے ایک خط نکالا اور اس خط کو حسین کے ہاتھ میں دے کے کہا "لے! اس خط کو احتیاط سے رکھ اور اسی وقت روانہ ہو کے شہر اصفہان کی راہ لے۔ یاد رکھ کہ اصفہان کے شمالی پھاٹک کے باہر ایک شکستہ اور قریب الانہدام مسجد ہے۔ اسی مسجد میں تو ایک فقیر کو پائے گا جو بظاہر تو بھیک مانگتا ہے مگر باطن میں بڑا خداشناس شخص ہے۔ یہ فقیر ہر وقت ایک دنبے کی کھال اوڑھے رہتا ہے اور انکسار یہ صدا لگا کے راہگیروں سے مانگتا ہے کہ "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ"۔ کاظم جنونی اس کا نام ہے۔ یہ خط لے جا کر اس شخص کے ہاتھ میں دے اور میرا سلام کہہ۔ رات کو وہ تجھے ایک غار میں لے جائے گا۔ جہاں تو ایک بڑے واقف اسرار سرمدی سے ملے گا اور اسی وقت سے تو جنت کے مدارج طے کرنا شروع کرے گا اور چند ہی روز کی زندگی میں جو زیادہ تر خواب کی سی ہو گی، فردوس بریں کے اعلیٰ منازل میں جا پہنچے گا۔"

حسین نے یہ خط لے کے شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پھر رخصت ہونے کے طریقے سے اس کے قدم چومے اور اصفہان کی طرف رخ کر کے چل کھڑا ہوا۔ اب اس کا یہ سفر زیادہ اطمینان بخش تھا۔ گناہ کی ندامت و ملامت کے اثر کو شیخ علی وجودی کی تقریر نے اس کے دل سے بالکل محو کر دیا تھا۔ امید و آرزو کا باغ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمرد کے ہم کنار ہوا ہی چاہتی ہے۔ الغرض اسی اطمینان اور ان ہی مسرتوں کے ساتھ بغداد ہوتا ہوا اصفہان پہنچا۔ شمالی پھاٹک کے باہر مسجد کے دروازے پر متردد کھڑا تھا کہ کان میں آواز آئی "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ"۔ فوراً دوڑ کے مسجد میں گیا اور شیخ کا خط نکال کے کاظم جنونی کے ہاتھ میں دے دیا جو دنبے کی کھال اوڑھے بیٹھا زور و شور سے صدائیں لگا رہا تھا۔

کاظم جنونی نے حسین کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھا اور ایک جوش وحشت کے لہجے میں چلا اٹھا "حذر! حذر! اے اہل عالم حذر!" مگر جب خط کو پڑھا تو فوراً اٹھ کے بغل گیر ہوا اور کہا "میں نہیں سمجھا تھا کہ شجر معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔ آؤ بیٹھو! کھا پی کے آرام لو، رات ہو تو تم کو شیخ الجبل کے پاس لے چلوں۔ انہوں نے غیابۃ الجب اختیار کر لیا ہے۔ دن چونکہ مظہر نور ہے لہٰذا دن بھر وہ اپنے اوپر انوار لاہوت اکبر کا انعکاس کرتے ہیں اور رات چونکہ تیرہ و تار اور نمونۂ ظلمت ہے لہٰذا اسی ظلمت میں وہ مادی پیکروں سے ایک گونہ علاقہ پیدا کر لیتے ہیں۔"

حسین:- مگر معلوم نہیں مجھ سے گنہ گاروں اور سیہ کاروں سے وہ ملنا بھی پسند کریں گے یا نہیں؟

کاظم جنونی:- ضرور ملیں گے، شجر معرفت کی ایک شاخ تم بھی تو ہو۔

حسین دن بھر اسی مسجد میں رہا اور شام کے بعد جب ایک ثلث رات گزر گئی تو کاظم جنونی اسے ساتھ لے کے بیرونی کوہستان کی طرف روانہ ہوا۔ بہت سے نشیب و فراز طے کر کے اور کئی گھاٹیوں سے گزر کر کاظم ایک بڑے غار کے دہانے پر ٹھہر گیا اور زور سے چلایا "یا شیخ الجبل! ظلمت مادہ میں ایک جگنو چمکا"۔ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ پھر کاظم

جونی نے پکار کے کہا! "ایک آئینے سے پردہ اٹھا جو تجلیات انوار الٰہی سے منعکس ہونا چاہتا ہے۔" اب بھی کوئی آواز نہ آئی۔ کاظم جونی پھر پکارا: "ایک آتشیں پیکر کا متقید اسرار سروشتستان جاننے کے لیے بے صبر ہے۔" اس تیسری صدا پر غار کے اندر سے چٹانوں میں گونجتی اور اندھیرے میں سنسناتی ہوئی آواز آئی! "مرحبا! جوان آ ملی مرحبا! جنت کی ایک حور دو سال سے تیرے فراق میں بیتاب ہے۔ میں نے اپنی سیرگاہوں میں ایک طرف اس حور کو فردوس بریں کے کوشکوں میں دیکھتے اور دوسری طرف تجھ کو راہِ طلب میں قدم مارتے دیکھا ہے۔ اب یہیں سے تجھے لذائذ سروشتستانی حاصل ہونے لگیں گے۔ جا! اور قدرت کے کرشمے دیکھ۔"

اس جملے کے ساتھ ہی غار کی تہ میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور کاظم جونی نے حسین سے کہا: "بس اب آگے میں نہیں چل سکتا۔ مجال نہیں کہ ایک قدم بھی آگے بڑھاؤں۔"

حسین: ۔ کیوں؟

کاظم جونی: ؎ اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

جاؤ اور یقین جانو کہ تم شجرِ معرفت کی ایک شاخ ہو۔ یہ سنتے ہی حسین نے جونی کو اوپر چھوڑا اور خود جوشِ دل کی بے خودی میں امید و آرزو کے خواب دیکھتا ہوا غار میں اترا۔ تھوڑی دور تک تو ادھر ادھر کی چٹانوں سے ٹکریں کھاتا رہا مگر جب انتہا پر پہنچ گیا۔ جہاں اسے روشنی نظر آئی تھی۔ تو داہنی طرف ایک زینہ ملا۔ اس زینے کے ذریعے سے وہ اور زیادہ نیچے گیا۔ تو اپنے وہم و گمان کے خلاف اس خوفناک کوہستان اور درندوں کے مسکن کے نیچے ایک نہایت ہی وسیع و عالیشان اور بہت بارونق مکان نظر آیا۔ جس میں ہر طرف کافوری شمعیں روشن تھیں۔ عود و لوبان سلگ رہا تھا۔ در و دیوار پر طلائی رنگ بھر کے نقش و نگار بنائے گئے تھے اور انہیں بیل بوٹوں میں رنگین پتھر اور شیشے کے ٹکڑے جڑے تھے جن پر شمعوں کا عکس پڑ کے ہر سمت ایک عجب عالم نور پیدا کر رہا تھا۔

حسین اس تمام سامان عیش کو دیکھ کے مبہوت و از خود رفتہ ہو گیا۔ ایک بے صبری کے جوش میں چلا اٹھا۔

"کیا فردوس بریں یہی ہے؟"

کہیں قریب ہی سے تسلی آمیز لہجے میں آواز آئی۔ نہیں۔ مگر سروشتستان کی سیر کرنے والوں کے لیے یہ پہلی منزل ہے جس میں ٹھہرا کے وہ اس قابل بنائے جاتے ہیں۔ کہ جنت کی مسرتوں کو یکایک دیکھ کے از خود رفتہ نہ ہو جائیں۔

حسین: ۔ مگر آپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے شکر گزار ہوں؟۔

آواز: ۔ میں تیرے قریب ہی ہوں۔

ناگہاں ایک لاجوردی منقش پردہ جو پہلے دیوار کا دھوکہ دے رہا تھا۔ یکلخت نظر سے غائب ہو گیا۔ اور ایک معمر مگر قوی الجثہ اور نہایت ہی نورانی صورت کا آدمی نظر آیا۔ جو زرتار مسند پر گاؤ تکیے سے لگا ہوا عجب بے پروائی اور بے نیازی کی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کا نورانی چہرہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ اور اس وقت چاروں طرف سے شمعوں اور زرین در و دیوار کے شیشوں کی ضو پڑنے سے آفتاب کی مثل چمک رہا تھا اور سفید لمبی ڈاڑھی منقش کی جھالر یا آفتاب کی کرنوں کا دھوکہ دیتی تھی۔ حسین یہ نورانی صورت دیکھتے ہی پروانے کی طرح دوڑ کے قدموں پر گرا۔ اور کہا۔ فرمائیے آپ کون ہیں! شاید رضوان آپ ہی کا نام ہے؟۔

پیرِ مرد: ۔ نہیں۔ ابھی تو اس تیرہ خاک دان عنصری ہی کی حدود میں ہے۔ مگر ہاں تیری آنکھوں پر سے پہلا پردہ اٹھا ہے۔ اہل دنیا مجھے شیخ العجب کہتے ہیں۔ مگر اہلِ حقیقت کی اصطلاح میں طورِ معنی کہلاتا ہوں۔

حسین: (حیرت سے) طورِ معنی! حقیقت میں یہی نور ہو گا۔ جو موسیٰ کو طور پر نظر آیا تھا۔

طورِ معنی: ۔ مگر تو اسے ستر ہزار حجابوں کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔

حسین: ۔ للہ وہ سب پردے بھی اٹھا دیجئے۔

طورِ معنی: ۔ ابھی ان مادی کثیف آنکھوں میں اس کی قابلیت نہیں مگر صبر کر۔ اسی کا سامان ہو رہا ہے۔ اور یہ سب پردے اٹھ جائیں گے۔

یکایک ایک خوبصورت نوعمر لڑکے نے آن کر ایک شربت کا لبریز جام طورِ معنی کے ہاتھ میں دیا۔ اور طورِ معنی نے اسے اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھا کے کہا۔ "لے اس جام کو پی اور ملکوت سے ایک درجہ اور قریب ہو جا۔" حسین نے فوراً وہ جام پی لیا جس کے ساتھ ہی اس کا دماغ چکر کھانے لگا۔ اور طورِ معنی کے سامنے لیٹ کر غافل سو گیا۔

اس غفلت اور از خود رفتگی کی نیند میں کئی دفعہ اس کی آنکھ کھلی۔ اور ہر مرتبہ وہ اپنے آپ کو ایک نئے مقام میں پاتا تھا۔ کبھی سرسبز و شاداب میدانوں میں ہوتا اور کبھی دہشت ناک اور پرخطر گھاٹیوں میں۔ ہر بیداری میں فرشتے یا انسان مگر کسی غیر معمولی قسم کے لوگ اسے سروشتستان سے اور زیادہ قریب ہونے کا یقین دلاتے اور وہ یقین کر لیتا۔ آخر ایک مرتبہ اس کی آنکھ کھلی۔ تو وہ ایک نئے جوان شخص کے سامنے تھا۔ یہ شخص حریر سرخ کے کپڑے پہنے تھا۔ جس پر سنہرا کام تھا۔ اس کے سر پر نہایت ہی قیمتی اور بیش قیمت تاج تھا۔ اور اس میں اعلیٰ درجے کے جواہرات ٹکے ہوتے تھے۔ حسین کی آنکھ جیسے ہی اس خوبصورت نوجوان کے سامنے کھلی۔ جو شاہانہ لباس پہنے اور مرصع تاج سر پر رکھے تھا۔ نہایت ہی التجا و عاجزی کے لہجے میں کہنے لگا۔ "امید اور انتظار نے بے صبر کر دیا ہے۔"

شخص: ۔ اے جسمِ خاکی! تو مراحلِ تجرد کو طے کر چکا۔ تجھے نہیں خبر۔ کہ تو آسمان کے قریب اور فردوسِ بریں کے دروازے پر ہے۔ اب نہ گھبرا۔ ملائکہ مقربین تیرے انتظار میں ہیں۔ اور حوریں تیرے لیے بناؤ سنگار کر رہی ہیں۔

حسین: ۔ اور آپ کون ہیں؟۔

شخص: ۔ میں وہ برزخ ہوں۔ جو لاہوت و ناسوت میں واسطہ ہے لیکن میرا جسم ہے۔ جو کبھی نور بن کر طورِ سینا پر چمکا تھا یہی وہ نور ہے جو مسیح کے جسم سے خدائی کی شان دکھاتا رہا تھا اور مردوں میں زندگی کا چراغ روشن کر دیتا تھا۔ یہی وہ نور ہے۔ جو اشراقِ مجرد کی شان سے رسولِ آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سینے میں چمکا۔ اور یہی وہ نور ہے جو امامت کی مشعل روشن کر کے معصوم جسدوں کو بدلتا رہا۔

حسین: ۔ تو آپ ہی جبرئیل ہیں۔

شخص: ۔ جبرئیل بھی میرے ہی تنوعات کی ایک چھوٹی شے ہے۔

حسین: ۔ شاید آپ ہی وہ حی لایموت ہیں؟

شخص: ۔ حی لایموت نہیں۔ حی کا حی۔ مگر اس شخص کے ساتھ میں یہ دعویٰ

نہیں کر سکتا۔ گو یہ ضرور کہوں گا کہ "انا خالق الارواح! انا خالق الاشباح" لیکن اس وقت تو ایک پیکر متحیر میں ہوں۔ اور وہ امام بن کے نمودار ہوا ہوں جس پر ایمان لانا ہر مکلف پر فرض ہے۔

حسین :۔ (ہاتھ سے ہاتھ ملا کے) تو میں بھی آپ کی امامت اور اس مظہر نقطۂ وحدت کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔

شخص۔ حسین سن! تو منزل مقصود کو پہنچ گیا۔ مدارج عروج طے ہو گئے۔ اور عنقریب اس پرجوش آغوش میں ہو گا۔ جو دو سال سے تیرے لیے کھلا ہوا ہے۔ اگرچہ اب کوئی دنیاوی عبادت تجھ پر فرض نہیں۔ تاہم ارضی کثافت کا باقی ماندہ اثر دل سے نکال ڈالنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ اس سرو گلستان کے پھاٹک پر تین دن تک بیٹھ کے تو ایک مختصر سی عبادت کرے۔ تین شبانہ روز تیری زبان سے صرف یہی کلمہ نکلنا چاہیئے۔ کہ "یا مرکز الانوار اغرقنی فی بحار الانوارک" مگر شرط یہ ہے کو چاہے کچھ کھائے مگر ان تین دن میں پانی کا کوئی قطرہ تیرے حلق سے نہ اترے اتنا کہہ کے یہ تاج دار شخص چند روٹیاں چھوڑ کے چلا گیا۔ اور اس کے جاتے ہی مکان کے سب دروازے یکایک۔ اور ایک ساتھ بند ہو گئے۔ حسین پہلے تو یہ حالت اور اپنی تنہائی دیکھ کے گھبرایا مگر فوراً اس آخری مرشد و امام کی نصیحت یاد آئی اور ریاضت و وظیفے میں مشغول ہو گیا۔ علی الاتصال ایک ہی جملہ کہتے رہنے اور پھر پانی نہ پینے کا یہ نتیجہ تھا کہ تیسرے روز پیاس نے مجنوں بنا دیا تھا۔ ہونٹوں سے لے کے سینے تک سارا گلا خشک تھا اور سوا سائیں سائیں کے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ مگر زمرد کے شوق میں وظیفے سے زبان نہ رکی اور اسی استقلال اور خود فراموشی سے دعا پڑھے جاتا تھا۔

تیسرے روز حسین زبان سے العطش پکار رہا تھا کہ وہ تاج دار نوجوان شاہانہ لباس پہنے ہوئے آیا اور کہا۔ "لے! اب سفر جنت کے لیے تیار ہو۔ تیری ریاضت پوری ہوئی۔ تو نے سب مراحل یقین طے کر لیے اور کوئی چیز باقی نہ رہی جو اس راہ میں تیری مزاحم ہو۔ مگر ہاں تو پیاسا ہے۔ ذرا اپنے آپ کو تازہ دم کر لے۔" اس شخص کی زبان سے یہ جملہ پوری طرح سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک نہایت ہی حسین و نازنین عورت ایک سونے کا مرصع جام ہاتھ میں لیے جو ایک خاص قسم کے لطیف و خوش رنگ شربت سے لبریز تھا، حاضر ہوئی! اس شخص نے جام کو اس حسینہ کے ہاتھ سے لے کر حسین کی طرف بڑھایا اور کہا! "یہی وہ شراب طہور ہے جس کے دور فردوس بریں میں ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ اس کے پینے سے تیری پیاس! ماندگی، تھکن اور جملہ بدمزگیاں جاتی رہیں گی اور تو ایک نہایت ہی نورانی و روحانی سرور کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا۔"

حسین نے فوراً وہ جام لے کے منہ سے لگایا اور پیاس کی ایسی شدت تھی کہ دو ہی تین گھونٹ میں اتار گیا۔ ایک لحظہ نہ گزرا ہو گا کہ اسے اپنے سر میں ایک گرانی سی معلوم ہونے لگی جس کے ساتھ ہی خمار آلود آنکھیں جھپک جھپک کے بند ہو گئیں وہ بے ہوش تھا اور بے ہوش بھی ایسا کہ سر و پا کی خبر نہ تھی۔

حسین کو نہیں خبر کہ یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی لیکن مدہوشی تھوڑی تھوڑی کم ہوئی تھی اور نشۂ غفلت اتنا خفیف سا ہوا تھا کہ ایک نہایت ہی دلکش اور وجد پیدا کرنے والے نغمے کی آواز کان میں آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا دل فریب و دل ربا پری پیکروں کا ایک طائفہ عجیب و غریب اور انتہا سے زیادہ پر لطف باجوں اور مزامیر کے ساتھ اپنے نور کے گلوں سے ولولہ خیز اور بہار کی مسرت انگیز دھن میں یہ ترانہ مبارکباد گا رہا ہے کہ "سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین"۔ ایک جوش مسرت کی بے اختیاری سے اس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف ایسا سماں نظر آیا کہ جدھر نظر جاتی ہے "کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست"۔ حسین نے اس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلاکار اور مرصع کشتی میں سوار ہے اور نازک بدن اور پری جمال لڑکیوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دلکش نہر کے کنارے ابھی ابھی آ کے ٹھہری ہے نرم اور نظر فریب سبزے کو شفاف، اور پاک و صاف پانی اپنی روانی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بعض مقامات پر گنجان اور سایہ دار درخت ہیں جو پیچیدہ اور خم دار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر خم آلود پیشانی پر دونوں طرف سے جھک پڑے ہیں مگر جہاں پر کشتی آ کے کنارے لگی ہے وہاں ایک کشادہ مرغزار ہے۔ ان خوبصورت لڑکیوں کے کہنے کے بموجب وہ کشتی سے اتر کے سبزہ زار کی سیر کرنے لگا۔ وہاں جا کے دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سے سبزے کا ایک پتلا اور برابر حاشیہ چھوڑ کے شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو نہر کے دونوں جانب حد نظر تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اگرچہ پھولوں میں شادابی و خوش رنگی کی وہی شان ہے جو صرف خود رو پھولوں میں نظر آتی ہے مگر اس قدرتی بہار کے ساتھ یہ لطف بھی ہے۔ کہ نہایت ہی لیاقت بلکہ بظاہر مافوق العادت ہوشیاری و دانائی سے چمن بندی کی گئی ہے۔ چمنوں کی بعض قطاریں تو ایسی ہیں جن میں ایک ہی قسم اور ایک ہی رنگ کے پھول ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فوج مختلف کمپنیوں پر تقسیم ہوتی حد نظر تک چلی گئی ہے۔ مگر اکثر چمن ایسے ہیں جن میں مختلف رنگ کے پھولوں کو ترتیب دے کے زمین پر ایسی ایسی گل کاریاں کی گئی ہیں کہ عقل انسانی حیرت میں آ جاتی ہے۔ سارا مرغزار اور ساری وادی جو کوسوں تک پھیلی ہوئی ہے اور جسے خوبصورت اور متوازی اور سرسبز و شاداب پہاڑوں نے اپنے حلقے میں کر لیا ہے، از سر تا پا ان ہی چمنوں اور پھولوں سے بھری ہے اور مختلف نہریں جو آبشاروں کی شان سے اور پانی کی چادریں بن بن کے پہاڑوں سے اترتی ہیں، ان ہی چمنوں اور پھولوں کے درمیان میں جابجا بہہ رہی ہیں اور ان کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوشبو سے متاثر ہو کے یا کسی اور وجہ سے گلاب اور کیوڑے کی شان پیدا کر لی ہے یہ نہریں زبان حال سے پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسنیم و سلسبیل ہیں۔ راستوں اور روشوں کی ترتیب میں یہ معجز نما کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر دھوتی ہے تو اس کے دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوشنما سڑک اپنے آغوش میں لیتی ہے۔ یہ سڑکیں چمن سے بھی زیادہ کمال صناعی دکھا رہی ہیں۔ مختلف قسم اور مختلف رنگ کے سنگ ریزوں سے ان سڑکوں کی تعمیر میں کام لیا گیا ہے اور ہر سڑک پر ایک خاص رنگ کے سنگ ریزے بچھا کے کوئی سڑک فیروزے کی، کوئی زمرد کی، کوئی یاقوت کی اور کوئی نیلم کی بنا دی گئی ہے۔ پھر ترتیب میں یہ لطف ہے کہ جس رنگ کے پھولوں کا چمن ہے اسی کے مناسب دوران رنگ کی پتلی خوشنما سڑک اسی کے پہلو سے گزری ہے۔ نغمہ سنج طیور ان چمنوں میں اڑتے پھرتے ہیں پھولوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کے عشق و محبت کی داستان سناتے ہیں۔ اور خدا جانے کس کمال استادی سے تعلیم دی گئی ہے کہ اکثر آنے جانے والے جہاں دیگر اطراف سے پری پیکروں کے

نورانی گلوں سے خیر مقدم کا ترانہ سنتے ہیں، وہاں ان نغمہ سنج طائروں کا بینڈ بھی اپنے قدرتی ارغنوں سے یہی کلمہ خیر مقدم سناتا ہے کہ "سلام علیکم طبتم فادخلوها خالدین"۔

حسین نے نہایت ہی جوش و حیرت سے دیکھا کہ ان ہی چمنوں میں جا بجا نہروں کے کنارے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں جن پر ریشمی پھولدار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ، پر تکلف اور طلائی گاؤ تکیے سے پیٹھ لگائے دل فریب اور ہوش ربا کمسن لڑکیوں کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خوب صورت آفتِ روزگار لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور کہیں نہایت ہی نزاکت اور دل فریب حرکتوں سے ساقی گری کر رہے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور گزک کے لیے سدھائے یا قدرت کے سکھائے ہوئے طیور پھل دار درختوں سے پھل توڑ توڑ کے لاتے ہیں اور ان کے سامنے رکھ کے اڑ جاتے ہیں۔ پھل ہی نہیں یہ خوش نما طیور کپڑوں میں لپٹے ہوئے کبابوں کی پوٹلیاں بھی لاتے ہیں۔ اور انہی لوگوں کے لیے مے کشی و شاہد پرستی کا پورا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے حسین کو متوجہ کیا، وہ یہ بات تھی کہ سب لوگ بے خلل و غش نہایت بے فکری و اطمینان سے ان لذتوں کے مزے لوٹ رہے تھے اور خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ پاس سے کون گزرتا ہے اور انہیں کس نظر سے دیکھتا ہے نہ کسی کو کسی سے حسد تھا اور نہ کسی کو کسی لطف کے چھپانے کی ضرورت تھی۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

یہ عالم دیکھ کے حسین کے دل میں ایک جوش و ولولہ پیدا ہوا۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا "بے شک فردوس بریں یہی ہے۔ یہیں آ کے نیکوکاروں اور ایمان داروں کو اپنے اعمال نیک کا صلہ ملتا ہے۔ مگر افسوس! اے زمرد تو کہاں؟" یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ پاس کے چمن کے پھولوں کے نیچے سے ایک شیریں دلکش آواز میں کسی نے کہا۔ "تو ابھی جنت کے چمنوں کو ہی دیکھ رہا ہے۔ ذرا محلوں اور قصروں کو بھی نظر اٹھا کے دیکھو۔" پہلو سے تو اس نے یہ آواز سنی اور سامنے سے ایک نہایت ہی نازک اندام اور قیامت خرام نازنین نے آ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور مسکرا کے کہا۔ "میں بھی تیرے لیے ہوں۔" حسین ذرا جھجک کے اس سے علیحدہ ہوا۔ اور غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا۔ "مگر میں پیاری زمرد کے سوا کسی کو نہیں چاہتا۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

نازنین: وہ بھی مل جائے گی۔ آپ کی خوشی کا پیمانہ تنگ ہے۔ ذرا ان سرمدی مسرتوں سے نگاہ اور دل آشنا ہو لیں۔ تو ان سے ملے گا۔ دیکھیے وہ سامنے جو موتی کا قصر ہے آپ ہی کے لیے ہے۔ اور زمرد اسی میں ہے۔

حسین نے نظر اٹھا کے اس رفیع الشان قصر کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر دیگر عمارتوں پر بھی جا پڑی اور وہ اسے نظر آیا کہ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ بعض بالکل سونے کی۔ بعض چاندی کی۔ بعض مونگے کی اور بعض موتیوں کی نظر آتی ہیں۔ یہ تمام مکانات جو حسب حیثیت محل، قصر اور کوشک کے لفظ سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ اشیاء کے علاوہ ان میں کوئی فیروزہ کا۔ کوئی زمرد کا۔ کوئی یاقوت کا۔ اور کوئی ہیرے کا ہے۔ موتی کے محل۔ جن میں سے ایک خاص حسین کے لیے ہے۔ کچھ ایسے آب دار رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ کہ نیچے سے اوپر تک ایک ہی موتی میں تراشے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جا بجا صدف صادق کے جھلکتے ہوئے ٹکڑے جڑے ہیں۔ تمام محلوں پر علاوہ اس رنگ کے جس کی طرف وہ محل منسوب ہیں۔ ہر در و دیوار کے گرد بلور اور شیشے کے ٹکڑوں کا حاشیہ بنا ہوا ہے اور ان شیشوں کے نیچے ڈاک دی ہوئی ہے۔ یہ آئینے دن کو آفتاب کی ضو میں اور رات کو ہزارہا کافوری شمعوں کی روشنی میں اس قدر چمک اٹھتے ہیں کہ تیز سے تیز نگاہ خیرگی کرنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ان ہی دیواروں میں اندر و باہر جواہرات بھی جڑے ہوتے ہیں۔ جو اپنی کرنیں چمکا چمکا کے ایک عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ بہر تقدیر اس مجموعی سامان، سنہرے، روپہلے اور رنگ برنگ قصروں ان کے آئینوں اور جواہرات نے ہر چہار طرف ایک ایسی نور کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان کے دل میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسین ان محلوں کو دیکھ کے ذرا تھوڑی دیر تک تو مبہوت کھڑا رہا۔ مگر ہوش آتے ہی اس خاص محل کی طرف دوڑا جس کی نسبت اس پری پیکر حور کی زبانی سنا تھا کہ خاص اس کے لیے ہے اور جس میں پیاری زمرد کے ملنے کی امید تھی۔ اب اس کے جذبات دل اس جوش و خود رفتگی سے زمرد کی طرف متوجہ تھے کہ اس نے نہ کسی چیز کی طرف نظر اٹھائی۔ نہ کسی سامانِ عشرت کو دیکھا۔ اور سیدھا اس قصر دری کے دروازے پر جا پہنچا۔ زمرد بھی استقبال کے لیے محل کے باہر نکل آئی تھی اور ایک غیر معمولی مگر نہایت دل ربا وضع سے بال کھولے اور زلفوں کو شانوں اور پیٹھ پر بکھرائے کھڑی تھی۔ آنکھیں دو چار ہونا تھیں کہ بے اختیاری کے جوش میں دونوں کی زبان سے ایک دوسرے کا نام نکلا اور دوڑ کے لپٹ گئے۔ حسین تو محو حیرت تھا ہی۔ زمرد کے چہرے سے بھی ایک غیر معمولی مسرت و جوش اور کسی قدر حیرت کے آثار نمایاں تھے۔ دیر تک دونوں لپٹے رہے۔ اور حسین دل کی پرجوش حرکت سے بے اختیار ہو کے رونے لگا اس کی سانس سے رونے کا پتا پا کے زمرد نے اپنے آپ کو علیحدہ کیا اور کہا۔
"حسین یہاں رونا حرام ہے۔ بس اب آنسو پونچھ ڈالو۔"

حسین: (آنسو پونچھ کے) زمرد! یہی فردوس بریں ہے؟

زمرد: یہی!

حسین: تم یہاں چلی آئیں۔ اور مجھے اسی درد و الم میں چھوڑ دیا۔

زمرد: یہ میرے اختیار کی بات تھی؟ مجھے تو ایک شہادت نے یہاں پہنچا دیا۔ مگر تمہاری زندگی باقی تھی۔ اور ضرور تھا کہ اتنے مدارج و مراحل طے کر کے یہاں آؤ۔ مگر سچ کہتی ہوں کہ اس جنت میں بھی تمہارے فراق نے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کیا کہوں۔ کن دشواریوں سے مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ تمہیں اپنے پاس آنے کا راستہ اور طریقہ بتاؤں۔

حسین: میرے تو ایسے اعمال تھے کہ شاید مر کے بھی یہاں نہ پہنچ سکتا صرف تمہاری محبت تھی جو خضر طریقت بن کے لائی۔

زمرد: لیکن اگر تمہارے دل میں طلب صادق نہ ہوتی۔ تو میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔

حسین: مگر اس طلب سے یہ تھوڑا ہی ممکن تھا۔ کہ میں اس ملاء اعلیٰ میں آ پہنچتا۔ میں تو دل میں ٹھان چکا تھا۔ کہ اس قبر کے پاس اور اس چٹان کے سامنے جس پر تمہارا پیارا نام کندہ ہے پڑے پڑے دم توڑ دوں گا۔

زمرد: خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب اندر چل کے آرام سے بیٹھو۔

شراب طہور کے دو ایک جام پیو۔ اور دیکھو، اس خداوند جل وعلا نے تمہارے لیے کیسے کیسے سامانِ راحت اور کیسی کیسی لذتیں فراہم کر رکھی ہیں۔ یہ کہہ کر زمرد حسین کو اندر لے گئی۔

جس وقت حسین نہر کے کنارے کشتی سے اترا ہے۔ سرِ شام کا وقت تھا۔ مگر اب رات ہو گئی تھی۔ ہر طرف کافوری شمعیں روشن ہو گئیں اور ایک خاص قسم کی ٹھنڈی روشنی جس کا پتا نہ چلتا تھا کہ کہاں سے آتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ دروازوں۔ بلند کھڑکیوں اور چھت کے روشندانوں سے رہ رہ کے چمک اٹھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایکا ایک ہزار ہتابیں چھوٹ سی گئیں۔ اس تیز روشنی میں شمعیں ماند پڑ جاتی تھیں۔ اور پیارے ہم صحبتوں کا چہرہ ایک دوسرے کو زیادہ بھلا اور دل فریب نظر آنے لگتا تھا۔ اس غیبی روشنی کو حسین نے حیرت سے دیکھا اور دریافت کرنے کے لیے کہ یہ کیسی روشنی ہے۔ وہ بار بار دروازے سے جھانک کے باہر دیکھتا مگر کچھ حال نہ کھلا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس روشنی کا مرکز گرد و نواح کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ہے۔ جہاں وہ زیادہ چمکتی ہے۔ اور وہیں سے اس کی کرنیں آکے تمام مکانات کو روشن کر دیتی ہیں۔ ایک یہ بات بھی اس نے دیکھی کہ یہ روشنی جب پوری تیزی اور کمال پر آجاتی۔ تو چاروں طرف سے لوگ چلا اٹھتے "ھٰذا الذی ما وعدنی ربی" سب کے ساتھ ایک بے اختیاری کے جوش میں یہی کلمہ خود حسین کی زبان سے بھی کئی مرتبہ نکل گیا جب اس روشنی کا راز حسین کے حل کیے نہ حل ہو سکا تو اس نے زمرد سے پوچھا۔ "یہ کیسی روشنی ہے؟"

زمرد: ۔ تم نے نہیں پہچانا؟ یہی وہ نورِ الٰہی ہے۔ جو موسیٰ کو وادیِ ایمن میں نظر آیا تھا۔ تم نے قرآن و احادیث میں پڑھا ہے۔ کہ جنت میں خدا کا دیدار ہوگا۔ اس سے یہی نور عبارت ہے۔

حسین: ۔ تو یہی خداوند جل وعلا ہے؟

زمرد: ۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ مگر ہاں اسی کے تجلی اولیٰ کی سب سے زیادہ مکمل اور سچی تصویر یہی ہے۔ یہ جواب سن کے حسین اس نور کے سامنے سجدے میں گر پڑا مگر زمرد نے اٹھایا اور کہا۔ "یہاں عبادت کی تکلیف نہیں؛ یہ نور صرف اس غرض سے ہے کہ لوگوں کے دل میں اطمینان کی مسرت پیدا ہو۔"

اب حسین نے مکان کے فرش اور تمام سامان کو دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب نعمتی سامان ہے جو دنیا میں نہ کبھی انسان کے دل میں گزرا ہے اور نہ کسی کے قیاس و گمان میں آسکتا ہے۔ زمرد اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیے یہاں کی تمام اعجوبہ چیزیں اسے دکھاتی پھرتی تھی اور ہر چیز پہ خدائے ذوالجلال والاکرام کی قدرت و رحمت کا جوش وجد و دلکشی سے اعتراف کرتا۔ اور آخر پھرتے پھرتے ایک مقام پر رک کے وہ نہایت گرمجوشی کے ساتھ زمرد سے لپٹ گیا اور کہا۔ "یہ سب لطف اور یہ سارے سامانِ عیش ہیں مگر زمرد میرے لیے کوئی تجھ سے بڑی نعمت نہیں ہو سکتی۔"

زمرد: ۔ یہی محبت یہاں لائی ہے، ورنہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی زندہ انسان کا بہت کم گزر ہوا ہے یہ تمہاری بڑی فضیلت ہے کہ اس جسمِ خاکی کے ساتھ اس نورستان میں آپہنچے۔ حسین کو جنت میں پھرتے اور زمرد کے حسن و جمال سے فائدہ اٹھاتے۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور یہ ہفتہ اس حالت میں گزرا کہ دلکش اور نشاط انگیز نغموں کی آواز اکثر کانوں میں گونجتی رہتی اور گو بہت سی حوریں اس کی خدمت کو حاضر تھیں اور سب پری جمال و نہایت قریب تھیں مگر اسے زمرد کے سوا کسی سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ ہر وقت زمرد کی بغل میں ہاتھ رہتا اور دونوں ہمیشہ فرحت بخش وادیوں اور روح افزا مرغزاروں میں ٹہلتے رہتے۔ زمرد نے اتنے ہی زمانے میں پھر پھرا کے اسے یہاں کی کل نزہت گاہیں اور سب دلچسپ مقامات دکھا دیے۔ ایک مرتبہ حسین نے کہا۔ "زمرد! میں تو سنتا تھا کہ جنت میں ہمیشہ صبح کا وقت رہتا ہے مگر آ کے دیکھا تو یہاں بھی وہی دنیا کے سے تغیراتِ زمانہ موجود ہیں؟"

زمرد: اس امر میں لوگوں سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر وقت صبح رہتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور کسی وقت کا لطف انسان یہاں اٹھا سکتا ہی نہیں۔ ایسا ہو تو جنت سے ایک بڑا لطف اٹھ جائے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر وقت کوئی ایسا مقام ضرور مل جائے گا جہاں انسان جس وقت کا لطف چاہے اٹھا لے۔

حسین: ۔ یہ کیوں کر؟

زمرد: ۔ زبان سے کہنے کی نہیں۔ میں چل کے تمہیں آنکھوں سے دکھائے دیتی ہوں۔ (یہ کہہ کے زمرد اسے ساتھ لیے ہوئے قصرِ دُرّی سے باہر نکل آئی اور کہا) "دیکھو یہاں دوپہر کا سماں ہے۔ اب آگے چلو۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ایک اونچے درختوں سے گھرے ہوئے سبزہ زار میں پہنچے جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے تھے۔ ہر طرف سے اندھیرا جھکا ہوا تھا اور مشرقی قصر ہائے کوہ سے ایک ایک ہلکی روشنی نمودار تھی۔ زمرد یہاں پہنچ کے بولی؛ "دیکھو یہ صبح کا وقت ہے؛ ہے نا؟"

حسین: ۔ بے شک ہے

زمرد: ۔ آگے چلو۔

یہاں سے روانہ ہو کے تھوڑی دیر میں دونوں ایک چھوٹی سی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف تاریکی پیدا کر دی تھی اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلکا ہلکا دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا؛ کہیں کہیں چراغ جلنے لگے تھے؛ طیور کے چہچہانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے ٹیلے پر آفتاب کے غروب ہونے کی سی شعاعیں نظر آرہی تھیں۔ زمرد نے یہاں رک کے کہا "اور یہ شام؟"

حسین: ۔ اس میں کسے شک ہو سکتا ہے!

زمرد: ۔ دن کا سماں دیکھ چکے، صبح دیکھ چکے اور شام بھی دیکھ لی؛ صرف رات کا لطف باقی ہے، چلو وہ بھی دکھائے دیتی ہوں۔ یہاں سے واپس آکے زمرد حسین کو لیے ہوئے ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوئی جہاں، نہایت خوبی سے ایک نقبی راستہ بنا ہوا تھا۔ زینے نہ تھے بلکہ زمین جو پختہ، مسطح اور رنگ برنگ تھی، ساعت بہ ساعت نیچی ہوتی جاتی تھی۔ اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت ہی عالیشان اور پُرتکلف قصر میں پہنچے۔ جس میں ہر جگہ کافوری شمعیں روشن تھیں۔ جھاڑ اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے اور در و دیوار پر بلور اور شیشے کے رنگ برنگ ٹکڑوں کو ان شمعوں کی شعاعیں کچھ ایسی عجیب و غریب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی۔

زمرد: ۔ دیکھو یہ رات ہے اور کیسی پیاری رات!

حسین: ۔ پیاری زمرد! اگر تو ساتھ ہو تو ہر چیز پیاری ہے۔

یہ سب سامان دیکھ کے دونوں اپنے قصر میں واپس آ گئے اور باہم عشق و محبت کی باتیں کرنے لگے۔ مگر پیشتر کے برخلاف زمرد اب کسی قدر افسردہ سی رہا کرتی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گو زبردستی کوشش کر کے چہرے کو بشاش بناتی ہے مگر

دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ حسین نے اس امر کو حیرت سے دیکھا اور کہا، "زمرد! اس فردوس بریں میں بھی آج تم مجھے ملول نظر آتی ہو؟"

زمرد: نہیں، مگر ہاں! گزشتہ مفارقت کسی کسی وقت یاد آجاتی ہے تو خواہ مخواہ دل بھر آتا ہے۔

حسین: مگر خدا نے وہ مصیبت کاٹ دی اور اب امید ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ یہاں ہی ایک دوسرے کے وصل سے لطف اٹھاتے رہیں گے۔

زمرد: خدا کرے ایسا ہو، مگر حسین! ابھی مجھے اس کی امید نہیں۔

حسین: (حیرت سے) امید نہیں! یہ جنت ہے جس کے لطف سرمدی و ابدی ہیں۔ یہاں نہ کسی دشمنی کا اندیشہ ہو سکتا ہے، نہ کسی حاسد کا حسد۔ پھر ناامیدی کا حسرت نصیبی کا کیا سبب؟ "ولا تقنطوا من رحمة الله"

زمرد: بے شک، مگر حسین تم یہاں قبل از وقت آگئے ہو۔ ابدی اور سرمدی لطف اٹھانے کے لیے وہی لوگ آتے ہیں جو مرنے کے بعد دنیا سے قطع تعلق کرکے آئیں۔ تم نے ابھی اس مادی دنیا کے علائق قطع نہیں کیے اور اس مادی جسم کو ساتھ لائے ہو جس کو وہیں دنیا میں چھوڑنے کے لیے تمہیں ایک دفعہ اس عالم میں ضرور جانا ہے۔ دیکھو حضرت مسیح یہاں زندہ آگئے اور اب تک ہیں مگر انہیں کبھی کسی لطف میں پورا مزہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ جانتے ہیں یہ قفس عنصری چھوڑنے کے لیے ایک مرتبہ دنیا میں پھر جانا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کثافتِ مادہ اس نورستان میں رہ ہی نہیں سکتی۔

حسین: افسوس! پھر میں کب جاؤں گا؟

زمرد: جب حکم ہو جائے، مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی جانا پڑے گا اس لیے کہ وہاں کی کئی شدید ضرورتیں تمہیں بلا رہی ہیں۔

حسین یہ سن کے آبدیدہ ہو گیا اور نہایت ہی جوشِ دل سے ایک آہ سرد کھینچ کے بولا! "آہ۔ ع روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد! مجھے تو ابھی تیرے وصال کا بھی لطف نہیں حاصل ہوا۔ مگر زمرد مجھ سے تو اب نہ جایا جائے گا۔ اب اس وقت سے میں ہر وقت تیرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رہوں گا تاکہ کوئی مجھے تجھ سے جدا نہ کر دے!" یہ سن کے زمرد بھی آبدیدہ ہو گئی اور بولی "حسین! یہ امر تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ جب وقت آئے گا، خبر بھی نہ ہو گی اور ایک ادنیٰ غنودگی تمہیں اس عالم میں پہنچا دے گی؟

حسین: (رو کر) پھر اب تو مجھ سے تمہارے فراق کی مصیبت نہ برداشت کی جائے گی۔ جاتے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں گا۔ اور تم سے چھوٹے ایک گھڑی بھی نہ گزری ہو گی کہ پھر تمہارے پاس آ پہنچوں گا۔

زمرد: کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ خودکشی کرلی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی۔ پھر تو قیامت تک بھی ملنے کی امید نہ رہے گی۔

حسین: (زور سے سینے پر ہاتھ مارکے) ہائے مجھ سے کیوں کر زندہ رہا جائے گا۔ زمرد خدا کے لیے کوئی تدبیر بتا ورنہ یہ سمجھ لے کہ ہمیشہ کے لیے مایوسی ہے۔ اس لیے کہ اب میں دنیا میں جا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہزار روکو مگر میرا خنجر میرے سینے پر اٹھ ہی جائے گا۔ اچھا اگر یہ نہیں تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔

زمرد: یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں، حسین! یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے بس میں ہوں...

اتنا ہی لفظ زبان سے نکلا تھا کہ کانپنے لگی اور اٹھ کے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ مگر جب کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان سے پاس آکے بیٹھ گئی اور بولی! "حسین! اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں، تمہارا واپس جانے کا وقت آگیا ہے۔

حسین: (بے صبری سے چلا کے) آگیا! ابھی سے؟ نہیں، میں ابھی نہ جاؤں گا۔ یہ کہہ کے زمرد کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کے پکڑ لیا۔

زمرد: ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی زیادہ بے صبری دکھاؤ گے، اتنے ہی زیادہ خراب ہو گے۔ اس وقت تنہائی میں باتیں کرنے کا ذرا موقع مل گیا ہے۔ غنیمت سمجھو اور جو کچھ کہتی ہوں سنو، کوئی آگیا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ پھر عمر بھر کفِ افسوس ملو گے! ساری دنیا میں بھٹکتے پھرو گے اور مطلب نہ نکلے گا۔

حسین: (اپنے آپ کو سنبھال کر) اچھا سنتا ہوں۔ پیاری زمرد تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ گی تو کام چلے گا۔ ورنہ...... مگر یہ جملہ نہیں پورا ہونے پایا تھا کہ جی بھر آیا اور زار و قطار رونے لگا۔

زمرد: (اپنے نازک ہاتھ سے اس کا منہ بند کرکے) کیا غضب کرتے ہو! خدا کے لیے سنبھلو؟ دنیا میں جا کے جی بھر کے رو لینا۔ مگر ابھی میری ایک بات ذرا ہوش و حواس درست کرکے سن لو۔

حسین: (نہ رکنے والے جوشِ گریہ کو روک کے) کہو پیاری۔ زمرد! دل و جان سے سن رہا ہوں۔

زمرد: یہاں سے جانے کے بعد پہلے تو تم کوشش کرنا کہ وہی لوگ جن کی مدد سے اس دفعہ یہاں آئے۔ انہیں لوگوں کی اطاعت کرکے اور انہیں خوش کرکے پھر یہاں آنے کا موقع پاؤ۔ اپنی حاجت روائی کے لیے تم ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کرنا لیکن اگر وہ تمہیں یہاں دوبارہ بھیجنے کا کسی طرح وعدہ ہی نہ کریں اور سب طرف سے مایوس ہو جاؤ تو پھر اسی وادی میں آکے ٹھہرنا جہاں میری قبر ہے اور جہاں خط بھیج کے میں نے تمہیں یہاں آنے کی تدبیر بتائی تھی۔

حسین: کوہ طالقان میں؟

زمرد: ہاں ہاں وہیں۔ اگر تم ایک مہینے تک وہاں ٹھہرو گے تو میں پھر کوئی تدبیر بتاؤں۔ دیکھو خبردار کسی کو خبر نہ ہو کہ میں نے وہاں بلایا ہے۔

حسین: مگر پیاری زمرد! وہ تدبیر اس وقت نہ بتا دو کہ یہاں سے جاتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دوں؟

زمرد: افسوس! تم نہیں سمجھ سکتے۔ بس تمہیں وہی کرنا چاہیے جو میں بتاتی ہوں۔ وہ تدبیر اس وقت بتانے کی نہیں ہے۔

حسین: دیکھوں اب کتنے دنوں ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

زمرد: صبر کرو اور ضبط سے کام لو! اور خبردار ایسی کمزوری اور بزدلی نہ دکھانا کہ خودکشی کا ارادہ کرلو۔

حسین: میں اسی کو ڈرتا ہوں۔ پیاری زمرد! تیرے عشق میں بعض وقت نہ اپنے ہوش میں ہوتا ہوں اور نہ اپنا نیک و بد سمجھتا ہوں۔ یہ تیرے ہی لیے تھا کہ میں نے اپنے چچا اور شیخ وقت امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر ڈالا۔

زمرد: جانتی ہوں، مگر اس میں مجھ کو نہ شریک کرو (کچھ آہٹ پا کے) بس اب خاموش ہو رہو۔

ناگہاں پھر سات حوریں ناز و انداز سے قدم رکھتی ہوئی سامنے آئیں اور محبت کے لہجے میں حسین سے کہنے لگیں۔

"اب چل کے باہر کی سیر کیجئے اور ان نورانی تختوں پر جلوہ افروز ہو جیے جو چمن کے درمیان میں ہیں۔ اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے اور شراب طہور کے جاموں میں خاص مزہ ہے۔"

حسین: میں تو یہاں تنہا ہی اچھا ہوں۔

زمرد: تو وہاں چلنے میں کیا مضائقہ ہے؟ چلو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔

حسین: خیر اگر تمہاری بھی یہی مرضی ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے؟

؎ رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

چلو!

اتنی دیر میں اور سب حوریں بھی آگئیں اور زمرد حسین کو ساتھ لیے قصر دری سے باہر نکلی۔ سب کے سب لالہ زار کے درمیان میں طلائی تختوں پر جا کے بیٹھے تخت کے دونوں جانب دو حوض تھے۔ جن میں سے ایک میں میٹھا دودھ بھرا تھا اور دوسرے میں شراب ارغوانی چھلک رہی تھی اور بغیر کہے صرف واقعات سے یقین دلایا جاتا تھا کہ ایک حوض کوثر اور دوسرا شراب طہور کا حوض ہے۔ سامنے چند حوریں بیٹھ کے عجب دلربا اور وجد میں لانے والی دھن میں گانے لگیں۔ دو چار غلمان یعنی خوبصورت کم عمر لڑکے سونے کے جام و صراحی لا کے کھڑے ہو گئے اور نغمہ و سرود کے ساتھ دور بھی چلنے لگا۔ دو چار جاموں نے حسین پر از خود رفتگی کی کیفیت پیدا کر دی اور جب وہ اس عالم نور کو بے خودی کی نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اسے نظر آیا کہ زمرد ایک ہاتھ کو اس کے گلے میں ڈالے ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھلکتا ہوا جام اس کے منہ سے لگا رہی ہے۔ حسین اس لطف محبت کا دل ہی دل میں مزا اٹھاتے اس جام کو پی گیا۔ مگر پینے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے زمرد کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح آنسو ٹپک رہے ہیں۔ مے بے خودی کے جوش میں پیاری دلربا کی دلدہی کے لیے بڑھنے ہی کو تھا کہ مدہوش گر پڑا۔ بس اس کے بعد اسے اپنے پرائے کی خبر نہ تھی۔ دیر کی آزار رساں غفلت و بے ہوشی کے بعد حسین ذرا ہوشیار ہونے لگا تھا کہ کان میں آواز آئی "اے جسم خاکی! اٹھ اور اس برزخ کبریٰ کا ہاتھ چوم جو تیرا امام ہے اور جس نے صرف تیرے لیے باوجود مجرد محض ہونے کی صورت مادی اختیار کر لی ہے"۔ حسین نے بے ساختہ آنکھ کھول دی اور باغ جنت یا زمرد کے پہلو کے بدلے اپنے آپ کو اس تاج دار شخص کے سامنے پایا جس کے ہاتھ پر اس نے بیعت کی تھی اور جو اس سفر جنت کی آخری منزل پر ملا تھا۔ جیسے ہی آنکھیں ملتا ہوا ادب سے اٹھ بیٹھا اور اس کے قدموں پر گر کے سر رگڑ کر کہنے لگا: "مکن بیداد ازیں خوابم خدا را"

شخص: نہیں تجھے پھر عالم ادنیٰ میں جانا ہے ہوشیار ہو جا کہ مشائخ باطن سے ہرگز گریز نہ کرنا میرا یہ ہاتھ جس میں نور کے سوا کسی مادے کا بہت ہی کم جز ہے، تیرے ہاتھ سے مل چکا ہے اور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ پر رہتا ہے جن کے وسیلے سے تیری اس ملاء اعلیٰ تک رسائی ہوئی۔

حسین: مگر میں ابھی اور چند روز جنت میں رہنے کا آرزومند ہوں:

شخص: اس مادی عالم کی زندگی میں یہ بھی تیرے حوصلے اور تیری کوشش سے زیادہ تھا۔ اب اس زندگی میں ممکن نہیں کہ تو پھر اس عشرت کدے میں آسکے جا اور اس وقت کا منتظر رہ جب کہ کسی دینی کوشش میں یا امام و مرشد کے حکم سے تو جام فنا پیئے گا۔

حسین: تو آپ میرے امام ہیں اور آپ ہی جام فنا پلا کے مجھے فردوس بریں میں پہنچا دیجیے۔

شخص: ابھی ملاء اعلیٰ کی سرحد ہے اور یہاں فنا نہیں اتنے میں وہی پہلی پری نازنین لبریز جام ہاتھ میں لیے ہوئے آئی جس کے دیکھتے ہی اس شخص نے کہا "بس اب زیادہ حجت نہ کر اور لے، یہ شراب طہور کا آخری جام پی"۔

یہ کہہ کے اس نے جام اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھایا۔ حسین اب جانتا تھا کہ یہ شراب طہور دارو بے ہوشی کا اثر رکھتی ہے اور جس طرح اس کا نشہ پہلے عالم بالا میں لے آیا، اب حضیض ظلمت میں لے جائے گا، مگر مایوسی کی تکلیف نے پیاس اس قدر تیز کر دی تھی کہ انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ بے تکلف لے کے پی گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی مدہوشی تھی اور وہی خود فراموشی۔ پھر اسی طرح تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کھول کے وہ مختلف سین دیکھنے لگا۔ حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے کبھی دشت و در تھے اور کبھی پہاڑوں کی بلندی و پستی آخر ایک شب کو اس کی آنکھ شیخ العجیب کے سامنے کھلی۔ راہ جنت کے اس پہلے نگہبان نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کے کہا "حسین! تو پھر اس تیرہ خاکدان عنصری کی حد میں آگیا اور ان آنکھوں سے جو انوار مقدسہ و مجردہ کو دیکھ چکی ہیں، پھر دنیا کو اسی طرح ستر ہزار حجابوں میں دیکھ رہا ہے"۔

حسین: (آب دیدہ ہو کر) مگر میں تو اب اس ظلمت کدۂ خاکی میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

طور معنی: بے شک نہ آتا، اگر جذبات نور وحدت ایسی ہی کشش رکھتے ہیں مگر کیونکر ممکن تھا کہ اس جسم خاکی کا دھبا اس نورستان میں ہمیشہ قائم رہتا۔

حسین: تو للہ کوشش کیجیے کہ اسی وقت اس جسم خاکی کو چھوڑ کے اس سرورستان اعلیٰ کا راستہ لوں۔

طور معنی: ان امور میں شیخ علی وجودی ہی تمہارا اطمینان کر سکتے ہیں؛ ان کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں اس پر عمل کرو۔

حسین: (جوش دل سے نوحہ و بکا کر کے) افسوس! میری اتنی ریاضت اور یہ مدتوں کی آرزومندی صرف اتنے مختصر زمانے کے لیے تھی؟ آہ کیا کروں کہ پھر زمرد کا وصال نصیب ہو؟

اس کے بعد حسین پھوٹ پھوٹ کے اور زار و قطار رونے لگا اور یہاں تک رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

طور معنی: اے بلند حوصلہ مشت غبار! میرے عزلت کدے کو خالی کر اور صفحۂ ارضی پر جا کے اس میعاد معینہ کو پورا کر، جتنے دنوں کے لیے تو اس ظلمت کدۂ ارض میں گرفتار ہے۔

حسین: کاش یہی معلوم ہوتا کہ اس مشت غبار کو کب تک اس عالم میں سرگرداں پھرنا اور خاک اڑانا ہے۔

طور معنی: تیرے لیے ان رموز کا حل کرنا شیخ علی وجودی کا کام ہے اس لیے کہ وہی تیرے مرشد ہیں۔ مگر ہاں، میں تجھے ایک راز بتا سکتا ہوں علاوہ یہ کہ

پھر اس عالم نور کی زیارت فقط اس امام کے اختیار میں ہے جس کے ہاتھ پر تو بیعت کر چکا ہے جو لاہوت و ناسوت کا برزخ ہے اور وہ تجلی ہے جو مختلف جسد ہائے امامت و نبوت میں ظاہر ہوتی رہی۔

حسین: مگر ان تک رسائی کیونکر ہو سکتی ہے؟ وہ اعلیٰ پر ہیں اور میں اس قعر ظلمت میں پھینک دیا گیا۔

طود معنی: گو ان کا مرکز و مقر وہی نورستان اعلیٰ ہے مگر ایک گونا تعلقات ہیں جن کی وجہ سے انہوں نے بہت سے جسد ہائے امامت بدلے انہیں اکثر اوقات اس آشیانہ میں کھینچ لاتے ہیں۔ لیکن بغیر مرشد کے اس غرض میں کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی اگر تو اصرار کرے گا تو تیرے مرشد شیخ علی وجودی اس امر میں تیری مدد کریں گے۔ بس اب تو اس خلوت کدۂ نور کو خالی کر اور مرشد کی قدم بوسی کے لیے روانہ ہو۔

اس تقریر نے امید کا ایک دھندلا چراغ پھر اس کے سینے میں روشن کیا جس کی روشنی میں وہ غار سے باہر نکلا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب دیکھا کہ کاظم جنونی غار کے دہانے پر اسی وضع و حالت میں کھڑا ہے جس وضع و حالت میں کہ وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ کاظم جنونی اس کی صورت دیکھتے ہی بولا! "اب تو تم کو اطمینان ہو گیا کہ شجر معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔"

حسین: اور آپ یہاں کب آئے؟

کاظم جنونی: ابھی تمہارے ساتھ ہی آیا تھا۔

حسین: ابھی؟

کاظم جنونی: ہاں ابھی!

حسین: مجھے تم سے رخصت ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔

کاظم جنونی: (ہنس کر) اس عالم اور اس عالم میں بڑا فرق ہے۔ یہاں کا ایک دن وہاں کے ستر برس کے برابر ہے۔

حسین: وہ ایک گھڑی بھی مگر تم یہاں ٹھہرے کیوں رہے؟

کاظم جنونی: امام قائم قیامت کا حکم یوں ہی تھا۔

حسین: امام قائم قیامت کون؟

کاظم جنونی: وہی جن کے ہاتھ پر اس عالم نور کے سفر میں تم نے بیعت کی ہوگی۔

حسین: مگر ان کے احکام تم تک کیونکر پہنچ گئے؟

کاظم جنونی: ان ہی مرشد کے ذریعے سے جو راہ حقیقت طے کرنے کے لیے میرے ان کے درمیان میں واسطہ ہیں۔

حسین: تو شاید تمہارے مرشد یہاں آئے ہوں گے؟

کاظم جنونی: اس کی کچھ ضرورت نہیں؛ وہ ایک توجہ سے اپنے خیالات میرے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔

حسین: افسوس میں جنت سے زبردستی کھینچ کے نکالا گیا!

کاظم جنونی: ان رموز ربانی کی شکایت نہ کرو! اور ان کے مصالح دریافت کرنا ہیں تو اپنے مرشد شیخ شریف علی وجودی کے پاس جاؤ۔ مگر یاد رکھنا کہ اب تم عالم نور کی سیر کر آئے ہو۔ لہٰذا ان کو اسی روحانی لقب سے یاد کرنا جو اس نورستان میں مشہور ہے۔

حسین: کیا ان کا کوئی اور لقب بھی ہے؟ میں نے تو نہیں سنا۔

کاظم جنونی: ہاں! اس عالم عناصر میں تو ان کا یہی نام ہے جو تم جانتے ہو مگر اس عالم نور میں وہ وادی ایمن کہے جاتے ہیں۔

حسین: (تعجب سے) وادی ایمن! (اور پھر ذرا سوچ کے) بے شک انہیں وادی ایمن ہی کہنا چاہیے۔ ان ہی کے پہلو میں مجھے نور حقیقت کی پہلی شعاع نظر آئی۔

کاظم جنونی: بس اب چلو اور حلب کا ارادہ کرو۔

حسین: مگر مجھے اتنا ضرور بتا دیجیے کہ اس عالم نور میں کبھی پھر بھی میرا گزر ہو سکے گا؟

کاظم جنونی: اس امر میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر تمہارے مرشد کی توجہ ہو تو سب باتیں ممکن ہیں۔

کاظم جنونی نے اس جملے سے حسین کے سینے میں امید کے چراغ کو ذرا اور اکسا دیا آخر دونوں نے اس وحشت ناک مسکن دام و دد کو چھوڑا اور شہر اصفہان میں آئے۔ کاظم جنونی نے اپنی مسجد کے دروازے پر پہنچتے ہی آواز لگائی۔ "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ" جس کے بعد حسین نے اسے رخصت کیا اور شہر حلب کی راہ لی۔

اس سفر میں حسین ہر وقت جنت اور اس کی حوروں کی ادھیڑ بن میں رہتا۔ اگرچہ اس کا جسم اس دنیا میں تھا لیکن اس کے خیالات اور اس کے اعتقاد میں اس کی روح علی الدوام اس دوسرے عالم نور کے مزے لیتی رہتی۔ وہ دل میں کہتا! "اتنے انقلابات کے بعد اب مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ موتوا قبل ان تموتوا کے کیا معنی ہیں؟ یا اس دنیا میں رہنے سہنے کے ساتھ انسان اس عنصرستان سے قطع تعلق کر کے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ عالم ملکوت میں کیونکر صرف کرتا ہے۔ اب اس مرتبہ جب کہ وہ اصفہان سے حلب کو جا رہا تھا اسے ایک بہت ہی نئی اور حیرت میں ڈالنے والی چیز نظر آئی۔ وہ جس گاؤں یا جس دشت و در میں گزرتا، اکثر لوگ خود بخود اسے پہچان لیتے کہ جنت کی سیر کر آیا ہے اور پاس آ کے مبارکباد دیتے وہ اس سے پریشان تھا کہ یہ کیا بات ہے اور کونسی علامت ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو میری حالت معلوم ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں سے اس راز کو دریافت بھی کیا مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ زمرد اب اس کے دل و دماغ پر پہلے سے زیادہ حاوی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر حالت میں اس کی دل فریب تصویر پیش نظر رہتی۔ وہ کبھی اپنی طرف بلاتی تھی اور کبھی صبر و تحمل کی تاکید کرتی تھی۔ یہی مزیدار اور پریشان کن خواب دیکھتا ہوا وہ شہر حلب میں پہنچا اور شیخ نے اٹھا کے اس کی پیشانی چومی اور وہیں ٹھونک کر اپنے برابر بٹھایا اور کہا: "اے حسین! تو لاہوت اکبر کی سیر کر آیا؟"

حسین: یا شیخ! اس عالم نور کی میں نے پوری کیفیت دیکھ لی۔ اور اے وادی ایمن! تیرے پہلو میں مجھے وہ جلوہ نظر آ گیا ہے جس کے اشتیاق کے سوال پر موسیٰ کو بھی لن ترانی کا جواب ملا تھا۔ مگر کیا کہوں کہ میں نے کن حسرتوں سے اس جنت نور کو چھوڑا ہے!

شیخ: اے تیرہ و تار مشت غبار! بتا تو نے وہاں کیا دیکھا؟

حسین: ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی۔

شیخ: جذبات نور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زمرد سے ملا تھا؟

حسین: (شیخ کے قدم چوم) ملا تھا، مگر ابھی سیری نہیں ہوئی۔ آدمی جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ نظر کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

شیخ: مگر تیرا جسم خاکی اس نورستان میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا اگرچہ روح

ہے اور تجھے یقین ہے کہ اس عالم نور کو تو نے آنکھوں سے دیکھا لیکن اے حسین میں کہتا ہوں کہ تو نے نہیں دیکھا۔

حسین: نہیں اے شیخ اور اے وادی ایمن! میں نے دیکھا اور اپنے خیال کی آنکھوں سے اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔

حسین کا یہ جواب سنتے ہی شیخ کو جلال آگیا۔ منہ میں کف بھر آیا، آنکھیں سرخ ہو گئیں اور ایک دفعہ جوش میں آ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جسم مارے غصے کے سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور انہوں نے کہنا شروع کیا: "اے متکبر و مغرور مشت خاک! تیری کیا مجال کہ نور لم یزلی کو ان ذلیل آنکھوں سے دیکھ سکے تو ان مادی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جن میں انوار ازلیہ کی اشعات لامعہ آدھی ضو کے ساتھ بھی نہیں چمک سکتیں۔ تیرے جسم کے سامنے وہ نور متغیر بن کے نمایاں ہوا تھا۔ اس کے اصلی کیفیات کو تیری یہ آنکھیں کسی طرح معلوم نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ہاں تو ان انوار کو دیکھے گا اور ان کی اصلی حالت و کیفیت میں دیکھے گا، مگر کب؟ جب اس جسم خاکی کو چھوڑ کے اور مجرد محض بن کے اس چیز نور میں جائے گا۔ اس وقت تجھے یہ بھی نظر آ جائے گا کہ انہی نور ازل کا ایک چراغ تو بھی ہے۔"

حسین: (کانپتی ہوئی آواز سے) مگر میں تو ابھی وہاں سے آنا نہیں چاہتا تھا۔

شیخ: بے شک نہ چاہتا ہوگا، مگر یہ ممکن نہ تھا۔ نور محض کثافت مادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حسین: لیکن اے شیخ! آپ وادی ایمن ہیں: اگر آپ چاہیں تو میں پھر اس عالم نور میں جا سکتا ہوں۔ آہ! زمرد کے لیے بہت پریشان ہوں۔

شیخ: (پھر طیش میں آ کے) اگر ہوس است ہمیں قدر بس است۔ اس نورستان کو مادے کے قبول کرنے کی اس سے زیادہ زحمت نہیں دی جا سکتی۔ آگ میں کسی مادی چیز کو ڈال دو تو اپنا تصرف کرنے کے بعد باقیماندہ کثافت کو الگ پھینک دیتی ہے اسی طرح اس نورستان نے تیرے جسم کو اپنے حیز سے نکال کے پھینک دیا۔

حسین: تو پھر آپ ہی اپنے ہاتھ سے مجھے اس جسم خاکی کی قید سے آزاد کیجیے کہ تجرد اختیار کر کے جاؤں اور پیاری زمرد کو اپنے آغوش میں لے لوں۔ کیا عجب کہ اس وقت تک وہ میرے شوق میں اپنا آغوش پھیلاتے ہوئے ہو۔

شیخ: اب وہاں تک تیری رسائی صرف امام قائم قیامت کی دست گیری سے ہو سکتی ہے۔

حسین: گو میں اس برزخ کبریٰ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں مگر اس درگاہ میں میری رسائی اسی وقت ہوگی جب آپ میری مدد کریں۔ آپ کی دست گیری سب پر مقدم ہے۔

شیخ: اچھا مایوس نہ ہو۔ مجھے تیرا ایک دفعہ اور امتحان لینا ہے؛ اگر تو اس امتحان میں پورا اترا تو میں تجھے اس دربار امامت میں سفارش کے ساتھ پہنچا دوں گا۔

حسین: جلد فرمائیے! جو حکم ہو اس کے بجا لانے کو تیار ہوں۔ میں موت کا سب سے زیادہ آرزومند ہوں۔ اگر اس امتحان ہی میں مجھے موت نصیب ہو گئی تو اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہوگی۔

شیخ: اسی وقت شہر دمشق کی راہ لے اور جس طرح بنے امام نصر بن احمد کو جو باطنیین کے خلاف وعظ کیا کرتے ہیں، قتل کر کے واپس آ۔

حسین: ابھی چلا، مگر مجھے اتنا اور بتا دیجیے کہ کیا ہم ہی وہ باطنیین ہیں جن کو کبھی لوگ قرامطہ کے اور کبھی ملاحدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں؟

شیخ: بے شک۔ امام اسماعیل بن جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کے داعی ہیں، اور چونکہ امامت ظاہر ہو گئی۔ لہٰذا ہم پر فرض ہے کہ اس تبلیغ و نقابت، خفیہ اور باطنی طریقوں سے کریں۔ انوار ازل سے یہ قائم ہی ہے۔ فیصلہ کر دیا ہے کہ جب تک امامت مخفی و باطنی ہو جاتی ہے تو نقابت و تبلیغ اعلانیہ ہونے لگتی ہے۔

حسین: مگر اس کا سبب میرے ناقص فہم سے بالا ہے۔

شیخ: (غصے سے گھور کے) بے شک بالا ہے اور تیرے جاہلانہ شکوک اور زیادہ بالا کرتے جاتے ہیں۔ خود خدا کی طرف اپنا خیال لے جا کہ وہ مخفی ہے اور اسی لیے اس کی توحید کی تبلیغ علانیہ ہوتی ہے۔

حسین: مگر یا وادی ایمن! نبوت تو ظاہر رہی اور اس کے ظہور کے زمانے میں برابر علانیہ تبلیغ ہوتی تھی۔

شیخ علی وجودی کے منہ میں پھر کف بھر آیا اور سخت برہمی کے لہجے میں وہ چلائے "ابھی تک شیطان تیرے دل میں بیٹھا ہے۔ وہ تجھے بہکا رہا ہے اور تو پھر عالم نور میں جانے کی آرزو کرتا ہے۔ او سن! اس نظام کا تعلق صرف امامت سے ہے۔ نبوت ہمیشہ ظاہر رہی اور ظہور کے زمانے میں علانیہ تبلیغ بھی ہوتی رہی؛ تاہم نبوت اور رسالت کس چیز کی طرف لوگوں کو بلاتی ہے؟ خدا کی طرف اور فردوس بریں کی طرف اور یہ دونوں دنیا کی نظر سے مخفی ہیں۔"

حسین: (ڈرتے ڈرتے) مگر امامت بھی تو ان ہی دونوں چیزوں کی طرف بلاتی ہے؟

اب شیخ کو غصے نے آپے سے باہر کر دیا تھا ایک دفعہ چیخ کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: "تو عالم نور کی سیر کر آنے پر بھی جاہل اور شکی ہے۔ عہد نبوت میں جنت اور وہ نور لایزالی اس قدر نمایاں تھے جتنے کہ اب عہد امامت میں ہیں۔ رسالت نے کبھی کسی مادی پیکر کو اس سردشستان میں نہیں بھیجا اور امامت برابر بھیج رہی ہے جس کا قطعی نتیجہ ہے کہ فردوس بریں اور وہ نور ازلی پہلے مخفی تھے اور اب نمایاں ہیں اور چونکہ اب نمایاں ہیں۔ لہٰذا تبلیغ و نقابت کو خفیہ طریقوں سے ہی اپنا عمل کرنا چاہیے۔

حسین: ہاں وادی ایمن! اب مجھے اطمینان ہو گیا اور ضرور تھا کہ اپنے ان شکوک کو رفع کرتا۔ اس لیے کہ میں نے اس مذہب کی نسبت بہت سی بے سروپا باتیں سنی تھیں، اور سنا تھا کہ التمونت کے قلعے میں لوگ طرح طرح کے فریبوں سے اس مذہب کے پابند بنائے جاتے ہیں۔

شیخ: یہ دشمنوں اور جہلا کی افترا پردازیاں ہیں۔ ایسے لوگ جن کو چشم بصیرت نہیں۔ اور جو ان انوار ازلیہ کے سامنے خفاش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، ان کے کہنے کا کیا اعتبار؟ اتنے مدارج یقینی طے کر کے تجھے نظر آ گیا ہوگا کہ ہم کس ملاء اعلیٰ پر ہیں اور کس آسانی سے سروشستان کی سیر کو آتے ہیں۔ اور وہ کس قعر جہالت میں پڑے ہیں اور کس طرح سخت خرابی کی طرف روز بروز زیادہ دھنستے چلے جاتے ہیں۔

حسین: مجھے معلوم ہے۔

یہ کہہ کے حسین شیخ سے رخصت ہوا اور امام نصر بن احمد کی جان لینے کے لیے دمشق کی راہ لی۔

حسین اب ایسے کاموں کے لیے زیادہ جری تھا۔ پہلے موقع پر جو شبہات اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے، اب نام کو بھی نہ تھے۔ اس کو یقین تھا کہ جنت یقیناً ہیں

لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کا وہ معتقد ہے اور ان کے اشارے پر ہر برے یا بھلے کام کا کرنا ہی ذریعہ نجات ہے۔ باوجود اس کے ایک جلیل القدر عالم کے قتل میں اس کے دل نے کسی قدر پس و پیش ضرور کیا، مگر شیخ اور زمرد کے خیال نے پھر اس کا دل آگے بڑھایا۔ وہ نہایت ہی سنگ دلی کے ساتھ مرشد کے وحشیانہ حکم کی تعمیل کے لیے دمشق میں پہنچا اور امام نصر کے عقیدت کیشوں میں شامل ہوگیا۔

اس سفر میں بھی وہ حیرت سے دیکھتا تھا کہ بعض لوگ راہ چلتے چلتے پہچان کے اس سے بغلگیر ہوتے اور یک جہتی و اخوت کا ثبوت دیتے۔ جس سے اسے یہ بھی نظر آجاتا تھا کہ اس کے ہم عقیدہ ہم خیال کس کثرت سے دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خوش نصیبی یا دل کی بے صبری سے ہفتے ہی بھر میں اسے اپنی غرض حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک پچھلی رات کو جب کہ امام نصر پڑوس کی مسجد میں اور سب سے چھپانے کے لیے اندھیرے میں تن تنہا کھڑے نماز تہجد ادا کر رہے تھے، حسین کا خنجر ان کے دل میں اتر گیا۔ حسین نے ایک ہاتھ سے ان کا منہ بند کر لیا تھا اور قتل کر کے گراتے ہی سینے پر چڑھ بیٹھا اور انہیں نیچے دبا کے بیٹھ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کی آواز نکلنے پائی اور نہ تڑپنے پائے۔ جب لاش بالکل ٹھنڈی ہوگئی تو وہ پچھلی رات کے سناٹے ہی میں مسجد سے نکلا چلا گیا۔ راستے میں ایک نہر کے کنارے بیٹھ کے اپنے کپڑے دھوئے اور حلب کو روانہ ہوا۔

شیخ علی وجودی نے اس کی کارگزاری کی داد دی اور اس کی پیٹھ ٹھونک کے کہا۔
"حسین! تو مراحل یقین کو بہت جلد طے کر رہا ہے امید ہے کہ اپنے اغراض میں کامیاب ہو۔"

حسین: یا وادی ایمن! مجھے ایک امر پر بڑی حیرت ہے، میں جہاں جاتا ہوں اور جس جگہ ہوتا ہوں میرے ہم خیال و ہم عقیدہ صورت دیکھتے ہی مجھے پہچان لیتے ہیں اور میں ان کو نہیں پہچان سکتا۔

یہ سنتے ہی شیخ نے اپنے صندوق سے ایک آئینہ نکالا اور اسے دکھا کے کہا۔
"اپنی صورت دیکھ، تجھے اپنے چہرے پر کوئی چیز نظر آتی ہے؟"

حسین: ہاں پیشانی پر ایک داغ ہے۔ مگر معلوم نہیں کیسا داغ ہے۔ شاید بچپن میں کبھی گر پڑا ہوں گا۔

شیخ: (مسکراتے) نہیں! یہ حور کے بوسے کا نشان ہے۔ یہی ایک مہر ہے جو ہمیشہ اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ انسان اپنے اس قفس عنصری کے ساتھ فردوس بریں کی سیر کر آیا ہے۔

حسین: تو جن لوگوں نے مجھے پہچانا، غالباً ان کی پیشانیوں پر بھی یہ حور کے بوسے کا نشان موجود ہوگا؟

شیخ: بے شک ہوگا! اور حسین دیکھ، میری پیشانی پر بھی موجود ہے۔

حسین: (شیخ کی پیشانی پر بھی وہی اپنا سا داغ دیکھ کے) بے شک یہ مدارج یقین طے کرنے کا تمغہ ہے۔

شیخ: حسین! یہ بہت بڑی چیز ہے۔ مرنے کے بعد سب مومنین جنت میں جائیں گے، مگر جو لوگ دنیاوی زندگی ہی میں اس مرکز نور کی سیر کر چکے ہیں ان کا یہ فخر وہاں بھی موجود رہے گا۔ یہ داغ وہاں پیشانیوں پر نور کی طرح چمکے گا اور عام ناجیوں میں ہم لوگوں کو ممتاز ثابت کرے گا۔

حسین: مگر مجھے یہ داغ اسی دنیا ہی میں عزیز ہے۔ کاش! میرے لب میری پیشانی تک پہنچ سکتے کہ میں اس داغ کو بوسے دے دے کے اپنے دل کی تسلی کرتا۔ میری پیشانی پر سوا زمرد کے اور کسی کے بوسے کا نشان نہیں ہوسکتا۔ اگر میرے بوسے لیے ہیں۔ تو صرف اسی کے لب لعلیں نے۔

ع بوسم کہ بے رنگ و نوا برگ حنا را
تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کف پا را

مگر افسوس! جس طرح زمرد میرے دل میں ہے لیکن ہاتھ نہیں آسکتی اسی طرح اس کے بوسے کا نشان ہر وقت میرے پاس ہے اور مجال نہیں کہ اپنے مشتاق ہونٹوں کو وہاں تک پہنچا سکوں۔

شیخ: اب ان شاعرانہ خیالات کو دور کر دو اور امام قائم قیامت کی قدم بوسی کے لیے تیار ہو۔

حسین: لبیک! مگر یا وادیٔ ایمن! اور بتا دیجیے کہ ان کو امام قائم قیامت کیوں کہتے ہیں؟

شیخ: یہ بھی رموز ربانی میں سے ایک رمز ہے۔ تجھے شاید ابھی تک ان ائمہ کے نام بھی نہ معلوم ہوں گے۔ جو نور لم یزل کی شعاعیں ہیں اور مختلف اوقات میں مختلف جسموں سے نمایاں ہوتی رہیں۔ یہی ائمہ ہمیشہ ناسوت اکبر ہوتے رہے ہیں وہی نور جو آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، عیسیٰؑ اور محمد صلوٰۃ اللہ علیہم کے اجساد مطہرہ سے لمحہ افگن ہوتا رہا تھا، حضرت علی مرتضیٰ کے جسد انور میں نمودار ہوا اور چونکہ اب نبوت ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس ایک نور یا ایک روح نے مختلف اجساد بدلنے شروع کیے۔ پھر حسین و علی زین العابدین و محمد باقر علیہم السلام کے اجساد کے سیر کرتے کرتے وہ نور جناب جعفر صادق کے جسد انور سے نمایاں ہوا اور وہ زندہ ہی تھے کہ ان کے پیکر جسدی کو چھوڑ کے پہلے جناب اسماعیل میں پھر محمد مکتوم ابن اسماعیل میں جو سابع تام تھے آیا۔ چند روز تک وہ نور سلسلہ وار امام منصور بن محمد مکتوم، جعفر مصدق اور حبیب بن جعفر کے اجساد مطہرہ میں خفیہ ہی خفیہ لمحہ افگن رہا۔ جناب اسماعیل سے اس وقت تک امامت مخفی رہی تھی۔ اب یکایک اس نور نے عبید اللہ مہدی کی ذات سے نمایاں ہو کے اپنی پوری تنویر دکھا دی اور امامت ظاہر ہوگئی۔ اس کے بعد سے وہ نور برابر علانیہ طور پر مختلف اجساد طاہرہ کو بدلتا رہا۔ پہلے قائم بامر اللہ کے جسم سے، پھر منصور کے، پھر المعز الدین اللہ کے، پھر عزیز باللہ کے، پھر حاکم المستقر باللہ کے جسم سے چمکا۔ مستنصر باللہ کے بعد نزار، پھر حسن ابن محمد یعنی علی ذکرہ السلام، پھر محمد ابن علی ذکرہ السلام کے جسموں نے لاہوتیت کبریٰ کا درجہ پایا۔ اور فی الحال وہی، نور امام رکن الدین خورشاہ کے جمال جہاں آرا سے نمودار ہیں جو فرمانروائے التمونت ہیں۔ وہی امام قائم قیامت البرزخ بین اللاہوت والناسوت اور وہ تجلی ہیں جو مختلف عہد ہائے امامت و نبوت سے لمحہ افگن رہی تھی۔

حسین: (حیرت سے) وہی جن کے ہاتھ پر میں نے اس عالم لاہوت میں بیعت کی تھی؟

شیخ: وہی!

حسین: مگر آپ تو فرماتے ہیں کہ وہ التمونت کے فرمانروا ہیں؟

شیخ: بے شک ہیں! مگر یہ علائق دنیوی ان کے تجرد اور ان کی اس نورانیت کو جو عالم سرگشت میں لے جاتی ہے۔ دھندلا نہیں کر سکتے۔ امام دینی اور عام لوگوں میں یہی فرق ہے کہ جس چیز کو ہم محنت و ریاضت سے حاصل کرتے ہیں انہیں فطرتاً بدرجہ اتم حاصل رہتی ہے۔ اسی لحاظ سے وہ عالمین کے برزخ کہے جاتے ہیں۔

حسین: اور وہ امام قائم قیامت کیوں کہلاتے ہیں؟

شیخ (کسی قدر برہم ہوتے ہوئے رک کر) ہاں میں نے اس کا راز ابھی تمہیں بتایا۔ امام مستنصر و نزار کے عہد میں انہیں انوار ازلی کی ایک نئی اور غیر معمولی شمع روشن ہوئی تھی گو یہ شمع دراصل اس قدیم نور امامت کا انعکاس تھی۔ مگر اتنا بڑا انعکاس کامل کہ اس کی ضو سے تمام ممالک ارض چمک اٹھے۔ اس سے وہ چراغ نور مراد ہے جو حسن بن صباح کے جسم صافی میں چمکتا تھا۔ یہ لقب قائم قیامت اسی آئینہ پرتو ایزدی کا ہے جس نے یکایک صعود عارج اعلیٰ اور نورستان میں پہنچ جانے کے اتنے صحیح ذریعے مخلوق میں پیدا کر دیے کہ ادنیٰ ادنیٰ لوگوں کو وہ کمال حاصل ہو گیا جو گزشتہ عہدوں میں سوا انبیاء اور ائمہ کے کسی کو حاصل نہ تھا۔ پہلے کوئی فردوس بریں میں جانے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا مگر اب اس اعلیٰ پرتو ایزدی کے ظہور کے بعد یہ حالت ہے کہ یوں آنکھیں بند کر کے ایک دم میں اس عالم نور کی سیر کرتا ہوں اور تم اور تم سے صدہا مومنین اس سرد شتان میں جا کے حوروں کی ہم کناری کا مزہ اٹھا آتے ہیں۔ قیامت کے معنی ظاہر پرستوں میں اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی مگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ قیامت صرف اس حالت یا وقت کا نام ہے جب کہ مخلوق کو خالق سے یا پرتو کو نور سے قربت ہو جائے۔ حسن بن صباح نے چونکہ اپنے عہد سے مخلوق کو ایسے تقرب کے درجے پر پہنچا دیا۔ لہذا وہ امام قائم قیامت کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ امام جس کی بدولت مخلوق و خالق میں قربت ہو گئی۔ اور اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ ان کے چند ہی روز بعد امام علی ذکرہ السلام میں وہ امامت قدیمہ جو جناب علی مرتضیٰ سے نسلاً بعد نسل چلی آتی تھی۔ نیز وہ امامت قائم قیامت جس کا چراغ پہلے پہل حسن بن صباح کے جسم میں روشن ہوا تھا۔ دونوں امامتیں جمع ہو گئیں اور گویا یک انوار ازلی ہیجان میں آ گئے۔ بس اسی وقت سے تمام تکلیفات شرعیہ بندوں پر سے اٹھا دیے گئے۔ رمضان کی ۱۷ کو اس قربت نور پرتو کا یہ جلوہ نظر آیا تھا۔ یعنی مومنین شرعی قیدوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اسی سبب سے وہ دن رات ہمارے لیے عید ہے۔ اور اس کی یاد میں یہ وظیفہ ہر وقت اور ہمیشہ ہماری زبان پر رہتا ہے۔

بر داشت غل شرع بہ تائید ایزدی
مخدوم روزگار علیٰ ذکرہ السلام

حسین (متحیر ہو کے) مگر میں تو دیکھتا ہوں کہ آپ شب و روز ریاضت ہی میں مشغول رہتے ہیں۔ اور آپ ہی کی طرح اس فرقہ ناجیہ کے جتنے پیر دیکھے سب پابند شرع، بڑے محتاط اور بڑے متقی و پرہیزگار نظر آئے۔

شیخ:۔ جو لوگ عرفان و حقیقت کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں ان کو بے شک عبادت و ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مگر مومنین پر فرض اب کوئی عبادت نہیں خاصۃً ان برگزیدگان بارگاہ لم یزلی کے لیے جو امام قائم قیامت سے تقرب رکھتے ہیں۔

حسین:۔ مگر یا دادی امین! میرا دل پھر آپ کی توجہ کا محتاج ہے۔ تکلیفات شرعیہ کا اٹھا دینا ایک ایسی چیز ہے۔ جس سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

شیخ:۔ (تیزی کے ساتھ) اتنے مدارج حقیقت طے کرنے پر بھی شک؟ سرد ستان اور عالم نور کی سیر کر چکنے کے بعد بھی شک؟ اب یہ شک نہیں گستاخی ہے۔ جانتا ہے کہ ساری عبادتیں خداوند جل و علا کی قربت حاصل کرنے کے لیے ہیں اور جب وہ قربت حاصل ہو جائے تو پھر کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم نے سنا ہے اور دیکھ بھی لیا ہوگا کہ جنت میں کوئی شخص عبادت کا مکلف نہیں۔ اس کا یہی منشا ہے کہ بس تقرب انوار لم یزلی کے لیے عبادت کرتے ہیں وہ وہاں پر ایک کو یوں ہی حاصل ہوتا ہے۔

حسین:۔ بے شک، وہ مرکز نور منزل مقصود ہے اور عبادت اس کا راستہ۔ جنت میں پہنچ جانے کے بعد فی الحقیقت کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن جو لوگ ابھی اس کے باہر ہیں۔ ان کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ وہ چل رہے ہیں اور راستے میں ہیں۔ لہذا ان کو عبادت کرنے کی ضرورت بھی ہے۔

شیخ:۔ انتہا سے زیادہ از خود رفتہ ہو کے اور منہ میں کف بھر کے) اس ہیکل خاکی کو شبہات نے خراب کیا۔ یہ بے جا شک کرتا ہے اور پھر شکوک میں پڑا رہتا ہے۔ سن اے حسین! امام قائم قیامت نے جو اپنے آپ کو بتایا کہ وہ اس عالم نور میں ہیں اور حیز عنصری سے باہر۔ اس کے یہی معنی تھے کہ گو بظاہر ان کا جسد اس عالم مادی میں نظر آتا ہے۔ مگر دراصل وہ ان مادیات سے دور اور اس سرد شتان اعلیٰ میں ہیں۔ ان سے ملنے اور ان کے جوار میں رہنے کے یہی معنی ہیں۔ کہ گویا انسان اس تیرہ و ظلمت کدہ ارض سے نکل کے لاہوت اکبر کے قریب جا پہنچا۔ پھر وہاں پہنچ جانے کے بعد عبادت کیسی؟

حسین:۔ بجا ہے میرا شبہ دور ہو گیا۔ آپ کی تقریر سے ہمیشہ دل کے شکوک دور ہو جاتے ہیں۔ اور اس اطمینان کے حاصل کرنے کے لیے میں اپنے شبہوں کو بلا تامل آپ کی خدمت میں عرض کر دیتا ہوں۔

شیخ:۔ خیر تم اس امتحان میں بھی پورے اترے۔ اب میں تم کو امام علیہ السلام کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ جاؤ اور ان کے احکام کی بلا عذر اطاعت کرو۔ آج صفر کی ۲۰ ہے۔ رمضان کی ۱۷ کو عید قائم قیامت ہوگی۔ اس تاریخ کو میں بھی وہاں آؤں گا۔ اور شیخ طور معنی بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اگر اتنے دنوں میں تم نے امام قائم قیامت پر اپنی اطاعت کیشی و عقیدت کا پورا اثر ڈال دیا۔ تو میں بھی تمہاری سفارش کروں گا اور طور معنی بھی کریں گے اور اسی وقت تم کو زمرد سے ملنے میں کامیابی بھی حاصل ہوگی مگر خیال رکھو کہ اس اعلیٰ دربار امامت میں انسان کے سر سے بہت تکلیفات شرعیہ اٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کی عبادت صرف اطاعت و انقیاد ہے۔ اور اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو پھر اس کا علاج نہ میرے پاس ہے اور نہ کسی اور شخص کے پاس۔ اس درگاہ کا راندہ مردود ازلی اور رحمت الٰہی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہے۔

حسین:۔ میں کسی حکم سے سرتابی نہ کروں گا۔

شیخ:۔ وہ ایسا مقام بھی نہیں جہاں تم اپنے دل کے شکوک کو اس بے تکلفی سے ظاہر کر دیا کرو۔ جس طرح میرے سامنے کرتے رہے ہو۔

حسین:۔ کبھی کسی امر میں شک نہ کروں گا۔

شیخ:۔ اگر اتنے مضبوط ہو۔ تو کل صبح کو یہاں سے روانہ ہو کے التمونت کی راہ لو۔ میں ایک خط دوں گا۔ اسے لے کے امام کی خدمت میں حاضر ہونا اور جب تک وہاں سے یا مجھ سے کوئی اور حکم نہ ملے۔ اس دربار کو نہ چھوڑنا۔

حسین:۔ ہرگز نہیں۔ اور یہ کہہ کے اس نے پھر شیخ کے قدم چوم لیے۔

دوسرے دن علی الصباح وہ شیخ علی وجودی سے خط سفارش لے کے رخصت ہوا اور مشرق کی راہ لی۔ چند روز میں بغداد و اصفہان ہوتا ہوا علاقہ رودبار میں پہنچا۔ اس سفر میں وہ اپنے ہم مذہبوں کو حوروں کے بوسے کے نشان سے بے کچھ کہے سنے اور بے بتائے پہچان لیا کرتا تھا۔ جو ہر شہر و قریے میں ملتے اور اس کے ساتھ نہایت ہی خلوص عقیدت سے پیش آتے۔ دیلم کے ایک گاؤں میں ایک باطنی شخص جو اپنی پیشانی کے نشان سے بتا رہا تھا کہ وہ بھی جنت الفردوس کی ہوا کھا آیا ہے۔ حسین کو نہایت ہی

خلوص و پاک دلی سے اپنے گھر لے گیا اور کئی دن تک مہمان رکھا۔ اس شخص کے گھر پر ایک صحبت میں کئی ایسے باطنی جمع ہوئے۔ جن کو اسی سال دو سال کے اندر جنت کی ہوا کھلائی گئی تھی۔ لوگوں نے صحبت کو اغیار سے خالی اور اپنے ہم عقیدہ و ہم خیال لوگوں ہی پر محدود دیکھ کے باہم جنت کا تذکرہ شروع کیا۔ اثنائے کلام میں ایک شخص بولا مگر مجھے جنت میں بھی ایک تمنا رہ گئی۔

دوسرا۔ (حیرت سے) وہ کیا؟

پہلا۔ وہاں ایک ایسی دلفریب نازنین نظر آئی کہ دل بے اختیار ہاتھ سے نکل گیا لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ ہزار کوشش کی۔ مگر اس آفتِ زمانہ حور نے بات کا جواب تک نہ دیا۔

دوسرا:۔ واقعی تعجب کا مقام ہے جنت میں تو ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ کسی حور کی طرف تمہارے دل کو میلان ہو۔ اور وہ التفات نہ کرے۔ تو یقیناً سارا لطف خاک میں مل جائے گا۔

یہ سن کے ایک تیسرا شخص بول اٹھا۔ حقیقت میں اس قسم کے بعض نقصانات وہاں انسان کو نظر آ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو میں نے شیخ کے سامنے بھی پیش کیا تھا۔ انہوں نے بہت آسانی سے میرا اطمینان کر دیا۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے کہا تھا اور گویا اس وقت بھی میرے کانوں میں کھڑے کہہ رہے ہیں۔ "تم اپنے مادی پیکر کے ساتھ ہزار ہا کثافتیں اور دنائتیں لے کے اس عالم نور میں جاتے ہو۔ اور پھر امید کرتے ہو کہ سرورستان کو اسی پاک و مجرد حیثیت سے دیکھو جس طرح غیر مادی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ یہ خود تمہارے نقصان اور تمہارے مادہ کا عجز ہیں۔ جو اس پیکرِ نور کو معیوب دکھاتے ہیں۔

پہلا: اور ہاں میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس حور کو وہ تجرد بھی نہیں حاصل جو اوروں کو ہے۔ اسی لیے کہ اس کے مادی تعلقات کلیتاً منقطع نہیں ہونے پائے تھے۔

دوسرا:۔ بے شک یہی سبب ہوگا۔ اوّل تو اس حور میں ذاتاً یہ نقصان موجود تھا۔ پھر تمہیں اپنی مادی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا۔

حسین:۔ (کسی قدر تعلق خاطر سے) اور کچھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا نام کیا تھا؟

پہلا۔ ہاں مجھے بتایا گیا کہ اس کا نام زمرد ہے۔ اور میری حور نے جس کے آغوش کا مزہ زندگی بھر نہ بھولے گا۔ یہ بھی بتایا۔ کہ اسے کسی خاکی پیکر سے اسقدر تعلق ہے کہ جنت کی سیر کرنے والوں میں سے کسی کی طرف التفات نہیں کرتی۔

دوسرے دن حسین یہاں سے رخصت ہو کے آگے روانہ ہوا۔ اور دو ہی چار روز میں قلعہ الموت کے پھاٹک پر کھڑا تھا۔

میرزا محمد ہادی رُسوؔا

حالاتِ زندگی میرزا محمد ہادی ان کا نام تھا۔ رسوؔا تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام آغا محمد تقی تھا۔ رُسوا کے آباء و اجداد ایران کے صوبے مازندران سے دہلی آئے تھے اور دہلی کو انہوں نے اپنا وطن بنایا۔ لیکن دہلی میں زیادہ دیر تک یہ خاندان نہ رہ سکا اور ترکِ سکونت کر کے اودھ میں آکر ڈیرہ جمایا۔ اسی صوبے کے شہرِ بے مثال لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب دور میں محمد ہادی رُسوا کی پیدائش ہوئی۔ ابھی نو عمری میں ہی تھے کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ایک رشتے دار (اغلباً ماموں) نے ان کی پرورش کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ لیکن یہ ماموں جان بڑے اچھے واقع ہوئے۔ رُسوا کو اپنے باپ کی طرف سے جو جائیداد ترکے میں ملی تھی۔ ماموں صاحب نے ان پر مخالفانہ قبضہ جما لیا۔ مرزا رُسوا کو پڑھنے لکھنے کا بچپن ہی سے بڑا شوق تھا۔ انہیں علم نجوم اور ریاضی سے خاص طور پر بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے عربی فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی خاصا عبور حاصل کیا۔ روڑکی میں اوورسیئری کا امتحان پاس کیا اور کوئٹہ، بلوچستان ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ اتفاق سے انہیں ایک عربی رسالہ ہاتھ آ گیا۔ اس میں کیمسٹری پر ایک مضمون تھا۔ بس اس کا پڑھنا تھا کہ رُسوا کی کایا ہی پلٹ گئی۔ نوکری سے استعفا دیا۔ کوٹھی بمعہ سامان کے نیلام کر دادی۔ اور تلاشِ علم کے لیے لندن سے سائنس کے آلات منگوائے اور لکھنؤ آکر تجربے شروع کر دیے۔ یہاں ایک مشن اسکول میں فارسی کی مدرسی مل گئی۔ گھر پر ہی انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد گھر پر بیٹھے بیٹھے ہی امریکہ کی اورنٹیل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔

رُسوا اگرچہ شاعر بھی تھے۔ لیکن انہیں شہرتِ دوام اپنے ناول امراؤ جان ادا کی وجہ سے ملی۔ یہ ناول لکھنؤ کی ایک طوائف کے بارے میں ہے اور اس عہد کے لکھنؤ کی مکمل معاشرت کو آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کے اکثر ناولوں کی معاشرت لکھنوی ہے۔ انہوں نے کسی جگہ بھی کوئی خیالی شہر یا خیالی کردار پیش نہیں کیا۔ ہمیشہ ہر مقام پر حقیقت بیانی سے کام لیا۔ وہ اپنے ناول کے پلاٹ کے کردار روزمرہ زندگی سے لیتے۔ انہوں نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مطالعے کی یہ گہرائی ہمیں ان کے ہر ناول میں اور خاص طور پر ذات شریف اور امراؤ جان ادا میں خاص طور پر دکھائی دیتی ہے انہوں نے نقشے کھینچے ہیں ہے تیے کرلے گھوں اور لکھنؤ کی اس رنگ ملی زندگی کے اصل واقعات اور نقشے پیش کیے ہیں۔ ان کے ناول جگہ جگہ فطری مناظر سے بھرے پڑے ہیں۔ وہ مقامات کی اصل تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ رُسوا کا انتقال اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ہوا۔

سنیئے مرزا رُسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کر پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد آوارہ وطن خانماں برباد ننگِ خاندان عارِ دو جہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنیئے اور اچھی طرح سنیئے۔

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا؟ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ اس کے پاس کچھ مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی، کچھ نائی، دھوبی، کہار، میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خان تھا۔

میرے ابّا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کا ہے میں اہم تھا کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اسقدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔ ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیئے۔ میں کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابا ابا کر کے دوڑا۔ دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھل جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بھیا کو گود میں اٹھا لیا۔ پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی

خالی ہاتھ گھر آتے تھے۔ کبھی وہ گتارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں یا کھیل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں وہ گتارا چھینے لیے جاتا ہے۔ میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں۔ ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے۔ ابا! گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ پھوپی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے۔ بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو۔ عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی ہاں میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ جب اماں کھانا پکا چکیں۔ مجھے آواز دی۔ میں گئی روٹی کی ڈلیا اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا۔ اماں نے کھانا نکالا۔ سب نے سیر ہو کے کھانا کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ابا نے عشاء کی نماز پڑھی۔ سو رہے صبح کو تڑکے ابا اٹھے۔ نماز پڑھی۔ اسی وقت میں کھٹولی سے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہو گئیں۔

میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے کبوتروں کو کھول کھلا دیتے تھے۔ ایک دو ہوا میں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارا سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں کیونکہ ابا پردن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینا پرونا لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلہ میں نکل گئی۔ یا دروازے پر املی کا درخت تھا۔ وہاں چلی گئی۔ ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوتے۔ بھیا کو دیا بٹھا۔ خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے۔ کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیونکہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھٹا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں بھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی۔ وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کھٹریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا۔ دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پر ایک کھپریل دو کوٹھریاں کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا۔ محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھرواتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کے نکلتے تھے تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلامیں کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھی۔ ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔ صورت شکل میں بھی اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسی بھی نہ تھی۔ جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی۔ ناک نقشہ بھی غیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے ناک اگرچہ ستواں نہ تھی۔ مگر پھینی اور پیسہ پھیری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ عیب تھا نہ اب ہے۔ اسی قطع پر پاؤں میں لال گلبدن کا پاجامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا ٹول کا نیفہ۔ نینو کی کرتی۔ تن زیب کی اوڑھنی ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں۔ گلے میں طوق۔ ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھلیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازہ تازہ چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری تھی۔ نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھی۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے۔ بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا۔ بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے۔ کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تصفیہ ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب شادی کی باتیں ہوتی تھیں۔ میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا۔ جو میرے ہم سن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے وہ تو کالا کالا ہے۔ میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے۔ میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے۔ ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے۔ میرا دولہا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا گلبدن کا پاجامہ مصالحہ کی ٹوپی، مخملی جوتا۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک پھینا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتے تھے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی۔ اور کیوں نہ خوش ہوتی۔ کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آ سکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہو گئی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔ مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چندا ڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا موا چاندی کا تھا۔ شاید ایک آنہ سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ یہ اب کہتی ہوں اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی۔ کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیے اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی۔ مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا میں چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آ گئے انہوں نے مجھے چمکارا۔ اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرہ ذرہ سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے مار بہت کھائی۔ مگر پھر بھی مجھے ان سے انتہا کی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگایا۔ گود میں اٹھایا۔ پیار کر لیا۔ جب دیکھا۔ اماں آتی ہیں۔ جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا اس پر اماں سمجھتی

تھیں۔ کہ میں نے رُلا دیا۔ لگیں گھڑکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بیقرار ہوگئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں۔ راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دعا پوچھتی ہیں۔ کسی سے تعویذ منگائی ہیں میرے جہیز کے لیے اپنے ہاتھ گلے کا گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوتے ہیں ان کو اجلوا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے۔ باقی نکال کے الگ کر دیئے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال کرو۔ اماں نے کہا سادہ جی ہو گا تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں۔ وہ بھی تو جائیں۔ کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں۔ سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی۔ تو لوگ طعنہ دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش۔ اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدائے آوارگی کی جوشش وحشت کا سبب

ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ جو کچھ کریں۔ کم ہے۔ کیونکہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں۔ جہاں ماسوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے۔ مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کر خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہوگئی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوگا کہ کم بخت اوداتی تھی۔ شادی ہونے میں دیر ہوئی۔ کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی اس نے چھوڑ دیا کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی۔ آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا ہے۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں۔ ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوئی۔ ماں باپ نے جہاں پایا۔ جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا۔ نہ صورت شکل دیکھی۔ نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی۔ نکل کھڑی ہوئی۔ یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا رانڈ ہو گئیں۔ صبر نہ ہو سکا۔ دوسرا کر لیا۔ یا بد صحبت ملی۔ آوارہ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو صحبت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا۔ جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خان جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ موا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ گیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلہ سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے ان میں ابا بھی تھے۔ آہ! بیچارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے اس پر طرہ یہ راستی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کر پوچھا۔

"دل جمعدار! تم سچ سچ کہو یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ انہی کی گواہی پر دلاور خاں قید ہو گیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مارا۔ لینے کو گئے نہ دیا۔ ابا چار آنے دیتے تھے۔ وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں کیوں نکل تھی۔ دیکھتی کیا ہوں املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا "چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دینے کے تھے کبوتر لے لو۔" میں اس کے دام میں آگئی۔ ساتھ چلی گئی۔ جا کے جو دیکھتی ہوں گھر میں کا فی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے ادھر میں مکان میں داخل ہوئی، ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دیا۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیئے اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا۔ مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا کہ گاڑی چل نکلی میں دم بخود ہو گئی۔ دلاور خاں جیل کے اندر مجھے گھٹنوں کے نیچے دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ ڈر کے مارے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا۔ آنکھوں سے باران جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا ہے۔ ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم کہ کس آفت سے ہے ماں باپ کا دالان آنگنائی باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا یہ سب خیالات ایک طرف تھے۔ اور جان کی حفاظت ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا۔ مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں: "دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا ...... تلملاتا پھرتا ہو گا؟"

پیر بخش: "بھئی تم نے بیشک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمہیں قید ہوئے؟"

دلاور خاں: "پورے بارہ برس ہوئے۔ بھائی لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خیر.... وہ بھی تو کون دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔"

پیر بخش: "کیا یہ بھی ارادہ ہے؟"

دلاور خاں: "تم سمجھتے کیا ہو۔ جان سے نہ مارا تو پٹھان کا تخم نہیں۔"

پیر بخش: "بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔"

دلاور خاں: "دیکھنا!"

پیر بخش: "اور اسے کیا کرو گے؟"

دلاور خاں: "کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں ٹوپ دو۔ راتوں رات گھر

چلے چلو"

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے دل میں ایک دھچکا لگا۔ منکا ڈھل گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دیئے بے حال دیکھ کر بھی موئے گرگٹ کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش: "اسے تو مار ڈالو گے اللہ ہمارا روپیہ"

دلاور خاں: "گئے گئے پانی"

پیر بخش: "کہاں سے دو گے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔"

دلاور خاں: "تم چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کے دے دوں گا؟"

پیر بخش: "تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو۔ ہم نہ ایک تجویز بتائیں۔"

دلاور خاں: "کہو"

پیر بخش: "اماں لکھنؤ میں چل کے اس چھوکری کو کوٹھے کر لو"

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی باتیں سن کر میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں: "اچھا دیکھا جائے گا۔ ابھی چلے چلو"

پیر بخش: "یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں۔ وہ سامنے کے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھر لیں"

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برابر ہوتا ہے۔ یکبارگی زور سے چیخ ماری چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے "حرام زادی چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا ...... نیل کرتی ہے۔"

پیر بخش: (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) نہیں بھئی نہیں ایسا کام نہ کرنا تمہیں ہمارے سر کی قسم اماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں: "اچھا جاؤ آگ تو لے آؤ"

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں (ایک کش حقہ کا پی کے) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو"

پیر بخش: "اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں ہمارے سالے کو جانتے ہو؟"

دلاور خاں: "کریم"

پیر بخش: "ہاں اسی کی روٹی اسی پہ ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑے گیا۔ لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لئے۔"

دلاور خاں: "آج کل کہاں ہے؟"

پیر بخش: "کہاں ہے؟ لکھنؤ میں گومتی اس پار اس کی سسرال ہے۔ وہیں ہوگا"

دلاور خاں: "بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟"

پیر بخش: "جیسی صورت ہو۔"

دلاور خاں: "بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟"

پیر بخش: "کوڑی ڈیڑھ سو جیسی تمہاری تقدیر ہوگی"

دلاور خاں: "بھلائی کی باتیں۔ سو ڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی تو بہت ہیں"

پیر بخش: "اچھا اس سے کیا ہے آؤ چلو۔ مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا "وہ تو ہم سمجھتے ہی تھے۔ تم کیا بیوقوف ہو"

رات بھر گاڑی چلا کر میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ طاقت سلب ہو گئی تھی۔ بدن سن ہو گیا تھا آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کرکے پیر بخش نے بیلوں کا کمبل اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک پڑی آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کمبل سرکا کے جو دیکھا۔ معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا سامنے کچھ کچے مکان ہیں۔ ایک بنیئے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے تھے۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے دیئے۔ میں رات بھر کی بھوکی تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا میں نے تھوڑا سا پیا پھر چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رکی رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونسے پڑے نہ گھرکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش دونوں جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے۔ کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ من کیا رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالو۔ پھر کوئی بات نکل آئی اس بات میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ بھی ہونے لگی۔ آستینیں چڑھ گئیں۔ کمریں کسی جانے لگیں ایک گاڑی پر سے کود پڑتا ہے۔ دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ بات رفت گزشت ہوئی پھر ملاپ ہوا۔ دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک: "ہمارے تمہارے لڑائی کی ہی کیا بات تھی؟"

دوسرا: "بات ہی کیا تھی"

پہلا: "اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔"

دوسرا: "جانے دو"

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد
شب اوّل ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اوّل کا حال تو آپ کو پہنچے۔ ہائے وہ بے کسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر زندہ بچی ہے۔ ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندوے! دنیا میں تو خیر اپنی سزا کو پہنچا مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی۔ موئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلاتی تو بھی مجھے مزہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح و شام جہنم کے گرز پڑتے ہونگے اور قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیسے میری جان کو کلپتے ہوں گے۔ بس مرزا صاحب! آج کی باتیں کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کے روؤں ......

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹی میں خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی میرے ماں باپ کی عزت۔ نہ دھبہ نہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ کب اس کو دیکھا تھا اس کو ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کا ایک لڑکا ماشاءاللہ چودہ پندرہ برس کا۔ دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا راستہ تھا۔ مگر دلاور خاں اس خوف سے کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے۔ نہ معلوم کن پیچیدار راستوں سے لایا کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی۔ کیونکہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گھومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان کریم کی ساس موئی مردے شوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی۔ ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چمچہ بھر ماش کی دال اور ایک بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہوگئی۔ آٹھ دن ہوگئے تھے۔ گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی خدا جانے کتنی دیر ہوئی کیونکہ اس اندھیری کوٹھڑی میں دن رات کی تمیز نہ ہوسکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا کوئی آس نہ پاس۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آگئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی۔ پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس ڈائن کی شکل بکتی اور بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ بیٹھی۔

"لونڈیا کتنی سوتی ہے رات کو جیسے جیسے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ کے اٹھایا۔ سانس ہی نہ لی میں تو سمجھی تھی سانپ سونگھ گیا۔ اے لو وہ تو پھر اٹھ بیٹھی" میں چپکے سنا کی جب خوب بک چکی تو پوچھنے لگی ......

"پاخانہ کہاں ہے؟" میں نے اشارہ دیا وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اس کوٹھڑی میں ایک کھڑکی لگی تھی اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آکے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس کال کوٹھڑی میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی اسی کوٹھڑی میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بیچاری کیسی چیکو پیکو روتی تھی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہوگیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہو رہیں۔

کسی بنیے کی لڑکی تھی رام دئی نام تھا۔ سیتا پور کے پاس کوئی گاؤں تھا۔ وہاں کی رہنے والی تھی۔

اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھول گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری تھی۔ بہت خوبصورت ناک نقشہ ڈیل ڈول چھریرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھڑی سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو پہر دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خاں اور پیر بخش نے مجھے آکے نکالا اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی پہلے ایک میدان پھر ایک بازار سے ہو کر گزری۔ پھر ایک پل پر آئے۔ تھوڑی دور کے بعد بازار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپی جا رہی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد ایک بازار پھر ملا۔ اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے یہاں بڑی بھیڑیں تھیں۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچی۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا۔ یعنی خانم جان کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینہ پر سے چڑھ کر اوپر گئی۔ مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے داہنی طرف ایک دالان وسیع میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ سفید۔ کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید دیا ہو۔ اودے مشروع کا پاجامہ چوڑے پائنچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے۔ کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کانوں میں سادی دھانیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسمہ کی رنگت ناک نقشہ ہو بہو انہیں کا سا تھا۔ مگر وہ نکسک اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سی لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔

کنول روشن ہے بڑا نقشی پاندان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

خانم جان :- "یہی چھوکری ہے؟"
پیر بخش :- "اسی کا معاملہ ہوگیا ہے"
خانم :- "کتنے پر؟"
پیر بخش :- "دو سو پر"
خانم :- "اچھا۔ خیر کہاں ہوا؟"
پیر بخش :- "ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحبزادے کے واسطے مول لیا ہے"

خانم: "صورت شکل اچھی ہے۔ اس قدر ہم بھی دے سکتے مگر تم نے جلدی کی۔"

پیر بخش: "میں کیا کروں۔ میں نے بہت سمجھایا میرے سالے نے نہ مانا!"

دلاور خاں: "صورت تو اس کی اچھی ہے۔ آگے آپ کی پسند۔"

خانم: "خیر آدمی کا بچہ ہے۔"

دلاور خاں: "اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔"

خانم: "اچھا تمہاری ہی ضد سہی" یہ کہہ کے حسینی کو آواز دی۔ حسینی گوری سی سانولی ادھیڑ عمر عورت سامنے آکھڑی ہوئی۔

خانم: "حسینی"!

حسینی: خانم صاحب۔

خانم: صندوقچہ لاؤ۔

حسینی گئی صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دیئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا۔ کہ سوا سو روپے تھے ان میں کچھ روپے پیر بخش نے گن کر اپنے رومال میں باندھے۔ (شاید کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں موئے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کرکے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں اور بوا حسینی اور میں ہوں۔

خانم صاحب: (حسینی سے) "حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں میں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی؟"

حسینی: "مہنگی۔ میں کہتی ہوں سستی"۔

خانم: "سستی بھی نہیں ہے۔ خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے! ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔"

بوا حسینی: ہم! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہیں موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا۔ آخر یہاں نہ بکتی۔ کہیں اور بکتی۔

حسینی: خانم صاحب۔ یہاں پھر اچھی رہے گی آپ نے سنا نہیں بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں۔

خانم: سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے۔ سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ سیخوں سے داغ کے مار ڈالا۔

حسینی: دنیا میں جو چاہیں کرلیں۔ قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔

خانم: منہ کالا ہوگا۔ جہنم کے کندے پڑیں گے۔

حسینی: خوب ہوگا۔ موؤں کی یہی سزا ہے۔ اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔

بیوی! یہ چھوکری تو مجھے دے دیجئے۔ میں پالوں گی۔ مال آپ کا ہے۔ خدمت میں کروں گی۔

خانم: تمہیں پالو۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی: بچی! تو کہاں سے آئی ہے؟

میں: (رو کے) بنگلے سے۔

حسینی: (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے؟

خانم: اے ہے کیا ننھی ہو۔ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں۔

حسینی: (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟

میں: جمعدار۔

خانم: تم بھی غضب کرتی ہو بھلا وہ نام کیا جانے۔ ابھی بچہ ہے۔

حسینی: اچھا تمہارا نام کیا ہے؟

میں: امیرن۔

خانم: "بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو امراؤ کہہ کے پکاریں گے:"

حسینی: "سنا بچی! امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی "امراؤ" تم کہنا جی" اس دن سے امراؤ میرا نام ہوگیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی۔ لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔

خانم صاحبہ مرتے دم تک امراؤ کہا کئیں۔ بوا حسینی امراؤ صاحب کہتی تھیں۔ اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھڑی میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا مٹھائیاں کھلائیں منہ ہاتھ دھلایا۔ اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں۔ مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں۔ اماں باورچی خانے میں ہیں۔ اتنے میں ابا کو جو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔

خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے بیدار کیا آنکھ کھلی کیا دیکھتی ہوں: نہ گھر ہے نہ دالان، ابا ہیں نہ اماں، بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔ چراغ روشن تھا۔ میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے آنسو بھی برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی چند ہی روز میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی اور بھولتی نہ تو کرتی کیا۔ اوّل تو مجبوری دوسرے نئے ڈھنگ نئے رنگ۔ اچھے سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان کی باغوں کی سیر وہ کونسا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹر دل کی تھی۔ کہ بہت جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی ہوگئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں بسر کرنا ہے۔ جیسے نئی دلہن اپنے سسرال جاکے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں بعینہ وہی میرا حال تھا۔ راستے میں موئے ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف دو کوس ہے مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔

اک حال میں انسان کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا ۔

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا کس قدر وسیع تھا کتنے کمرے تھے۔ ان میں سب رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) خورشید میری ہمنشیں تھیں۔ ان میں اچھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی ان کے علاوہ دس گیارہ علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی سب گہنے پاتے سے آراستہ۔ ہر وقت بنی ٹھنی تولوال جوڑے پہنے سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے۔ وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نہیں نصیب ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جا نکلو سوا ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی چرچا نہ تھے۔ اگرچہ میں کمسن تھی مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے اپنے مطلب کی سمجھتی تھی۔ بسم اللہ خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کے میرے دل میں خود بخود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصہ میں میری بھی تعلیم شروع ہوگئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے استائی شروع کرا دی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سُر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سُر کومل سے اَت کومل سُدھ سے اُسُدھ یا تیور سے تیور تر ہو جائے اور میری بھی جھینپ کرنے کی عادت تھی پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔

ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گا رہی تھی۔ دھیوت سُدھ لگا گئی۔ استاد جی غنڈ کا۔

خانم صاحب نے پھر اسی کو کہلوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے گھور کے دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم: "استاد جی! یہ کیا تھا۔ رام کلی میں اوچار دھیوت سے ہے اور وہی سر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں۔ دھیوت کومل ہے یا سُدھ؟"

استاد: "کومل"

خانم: "او چھوکری! تو نے کیا کہا تھا؟"

استاد: "سُدھ"

خانم: "پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں؟"

استاد: "کچھ مجھے خیال نہیں رہا۔"

خانم: "واہ خیال نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہلوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ابھی کسی سمجھدار کے سامنے اسی طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔" استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوتے چپ ہو رہے مگر دل میں بات لیے رہے۔ استاد جی اپنے کو نایک سمجھتے تھے اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن سے خانم کا ٹوکنا ان کو بہت ہی ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گا رہی ہوں۔ خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا گندھار اس میں کومل ہے یا اَت کومل؟

استاد جی ۔ اَت کومل ۔

خانم ۔ خاں صاحب! ماشاءاللہ ۔ یہ میرے سامنے ۔

استاد ۔ کیوں؟ ۔

خانم ۔ اور پھر آپ مجھ ہی سے پوچھتے ہیں کیوں؟ سوہا میں گندھار اَت کومل ہے۔ بھلا آپ تو کہیے ۔

استاد ۔ دیکھنے لگے، گندھار کومل لگائیے ۔

خانم ۔ بس آپ ہی قائل ہو چکے۔ خود آپ کومل کہیں اور چھوکری کو بہکاتے ہیں۔ یا مجھے کہتے ہیں۔ خاں صاحب میں کچھ عطائی نہیں، خاک چاٹ کے سیکھی ہوں۔ گلے سے نہ ادا ہو۔ مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا۔ میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ؟ اگر بتانا ہو تو دل سے بتائیے۔ نہیں تو معاف کیجئے۔ میں اور کوئی بندوبست کر لوں گی۔ چھوکریوں کو خارت نہ کیجئے ۔

استاد جی ۔ بہت خوب ۔

یہ کہہ کے اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں ۔

چند دن کے بعد خلیفہ جی بیچ میں پڑے صفائی ہو کے ملاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتنا نہ سمجھتے تھے۔ عمر بھر حیرت رہی۔ مجھے کہ خانم زیادہ جانتی ہیں۔ یا استاد جی۔ کیونکہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں۔ استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے۔ یا جان بوجھ کے بتاتے نہ تھے۔ لاکھ صفائی ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی یہ لوگ گُر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوا میں سمجھتی۔ کہ استاد جی ٹالتے ہیں۔ استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت ہی خوش ہوتی تھیں بسمہ ۔ کو لعنتیں دیا کرتی تھیں۔ بسمہ پر بہت محنت ہوئی۔ مگر پڑھا، بھرتی کے سوا کچھ نہ آیا اس پر بھی کسے سے [illegible] رہیں۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری تھی گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی ان نے سیکھا بھی تھا ان کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جائے ۔

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں مگر صورت دیکھ کر رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے الٹا توا۔ اس پر چیچک کے داغ۔ پاؤ بھر تیل بھر دو ڈوبا جائے۔ لال لال آنکھیں۔ بھدی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی۔ موٹے موٹے ہونٹ بڑے بڑے دانت۔ فربہ انتہا سے زیادہ۔ اس پر ٹھنگنا قد یونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کہتے تھے مگر قیامت کا گلا تھا۔ معلومات بہت اچھی [illegible] انہیں کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھیں۔

میں: "باجی ہاں! ذرا سرگم تو سنا دو۔"

بیگا: "سنو۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔"

میں: "میں یہ نہیں مانتی۔ سُر تیاد الگ الگ کر کے بتاؤ۔"

بیگا: "لڑکی! تو تو بہت ستاتی ہے اپنے استاد جی سے نہیں پوچھتی۔"

میں: "اللہ باجی تمہیں بتا دو۔"

بیگا: "سا رے گا ما پا دھا نی۔ دیکھو بائیس ہوئیں۔"

۴ ۳ ۲ ۴ ۴ ۳ ۲

میں (شرارت سے) "اوئی۔ میں نے نہیں کہیں۔ پھر کہو!"
بیگا۔ "جا اب نہیں کہتی۔"
میں۔ "واہ میں تو کہوا کے چھوڑوں گی!"
بیگا۔ (پھر وہی کہہ دیا) "لے اب دو نا؟"
میں۔ "ہاں اب کہی کہیں۔ تمہاری ہیں دو میں نا؟"
بیگا۔ "ہاں دو!"
میں۔ "تو ٹھیک باتیں ہوئیں۔ اچھا لے اب تینوں گرام کہہ دو۔"
بیگا۔ "لے اب تیلیے کل آئیے گا۔"
میں۔ "اچھا طنبورہ اٹھا لاؤں کچھ گاؤ!"
بیگا۔ "کیا گاؤں؟"
میں۔ "دھنا سری"۔
بیگا۔ "کیا گاؤں۔ آستائی۔ دھرپد۔ ترانہ؟"
میں۔ "اللہ باجی دھرپد گاؤ۔"
بیگا۔ "لے سن۔"

"تن کی تپ تب ہی مٹے جب پیا کو درشٹ بھر دیکھوں گی۔
جب درشن پاؤں گی ان کو تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی
الشت جام دھیان موہے اکو دسنت ہے نہ جلا ناکب درشن ہو گی
ہو کو مور پر بھو پیارے سے ملا دے وا کے پائن میں سیس ٹیکوں گی"

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی۔ صوفیانہ لباس، ہاتھ میں مجلد قرآن شریف اور حقیق کی انگوٹھیاں۔ خاک پاک کی تسبیح اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی۔ ہر وقت کی جریب، چاندی کی شام بہت ہی نفیس۔ ڈیڑھ خم حقہ۔ افیون کی ڈبیہ پیالی۔ غرضیکہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا ستھرا مذاق تھا۔ وضعدار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے جب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا۔ آج تک اسے نباہے جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڑھے ہیں اس جزبے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کا حوصلہ ہوتا تھا۔ مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پہ خدا کے دیئے گاؤں گراؤں۔ مکان، بیوی، جوان لڑکے لڑکیاں سب کچھ موجود تھا۔ مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے لیے تشریف لائے تھے یہیں رہے شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی کچھ آیا بھی کرتا تھا وہ روپیہ خانم صاحبہ دیتی تھیں یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے پینے حقہ افیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویلدار بوا حسینی تھیں۔ کپڑے بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔ خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت ہی مانتی تھیں۔ بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمہ لی تھی اس لیے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے۔ پاس ادب مانع ہے اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ جیسی کندۂ ناتراشش کو انہوں نے آدمی بنایا یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیروں رئیسوں کی محفل میں گئی حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ انہی کی بدولت آپ ایسے فائق فائق صاحبوں کے جلسے میں منہ کھولنے کی جرأت ہوئی شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا۔ اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا۔ "الف۔ بے" ختم ہونے کے بعد "کریما" "ما مقیما" محمود نامہ۔ حرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرایا جاتا تھا خصوصاً اشعار لفظ لفظ کے معنی فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی لکھنے پڑھنے پر بھی اشتغال رہا۔ املا درست کرایا گیا۔ خط لکھوائے گئے۔ گلستاں کے بعد اور کتابیں فارسی کی پائی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھایا جاتا ہے۔ عربی کی صرف نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں۔ اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ــ ہم نہیں ان میں جو پڑھتے ہیں طوطے کی طرح
مکتب عشق دو نا مجبر بہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا۔ گوہر مرزا حد کا شریر اور بدذات۔ سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا کسی کو منہ چڑھا دیا کسی کے چٹکی لی۔ اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی۔ اس کے کان دکھا دیئے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی۔ کہیں کتاب پہ دوات الٹ دی۔ غرضیکہ اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے۔ مگر اپنی آئی بانی سے نہ چوکتا تھا سب سے بڑھ کے میری گت بناتا تھا۔ کیونکہ میں سب سے اپلی اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتا تھا۔ میں نے مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے مار پٹوائی۔ مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں بھی چٹکیاں کھاتے کھاتے عاجز ہو گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو بہت ہی بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آ جاتا تھا۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازہ میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ انہی سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی۔ مگر دس روپیہ ماہ بماہ لڑکے کی پرورش کے دیئے جاتے تھے اور بیگم صاحب سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں۔ وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کمڑی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپنے ہی سے ذات شریف تھے۔ تمام محلہ کا ناک میں دم تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا۔ کسی لڑکے سے چوکوں کا پنجرہ دیکھنے کو مانگا۔ اس نے دے دیا آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی سب چوکے پھر سے اڑ گئے۔ غرضیکہ طرح طرح کے ادھم دیتے تھے۔ آخر ماں نے حاجی کے محلہ کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے۔ تمام مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے کرتے میں مینڈک چھوڑ دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی۔ ایک لڑکے کی جوتی اٹھا کے کوئیں میں ڈال دی۔

ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت نے ان کا نیا جوتا

جوتا حوض میں پھینک دیا۔ خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں کہیں مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پہ لے آئے۔ دروازے پہ سے پکار کے کہا، "لو صاحب اپنا لڑکا لو۔ ہم اسے نہ پڑھائیں گے۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب تو ادھر گئے۔ گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے ہوئے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ نہیں مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی : "اے ہے مولوی کاہے کو موا قصائی ہے لڑکے کا منہ مارے طمانچوں کے سجا دیا۔ اے تو کان بھی لہو لہان کر دیئے۔ بی بی ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے۔ آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیا چمکار کے دلار سے پڑھاتے ہیں۔" بنو نے چھوٹتے ہی کہا پھر بوا حسینی اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔"

بوا حسینی : "لے جاؤں مگر دور بہت ہے۔"

بنو : "تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی۔ شام کو بلا لیا کروں گی۔"

بوا حسینی : "اچھا تو بھجوا دیا کرو۔"

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا اس لیے بوا حسینی کو اپنی حسن خدمت پر پورا بھروسہ تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لیے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی۔ لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھ ہی کو ستاتا تھا۔ دن رات داد بیداد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت مارا مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا، اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ آخر میرے اس کے صلح ہو گئی یا یوں کہیے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہوگا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔ جب لکھ رہی ہوں۔ میرا سن کوئی تیرہ برس کا ہوگا اور گوہر مرزا کو چودھواں، پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزا آنے لگا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ ڈومنی کا لڑکا تھا۔ قدرتی کے وارے۔ تالے میں مشاق، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ ادھر میں نے سر سے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے، خوب جلسے ہوتے تھے کبھی میں گانے لگی وہ بجانے لگا۔ کبھی وہ گا رہا ہے میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پہ اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی۔ کیونکہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر عاشق تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو تو امیر جان یاد ہوں گی؟

رسوا : "یاد ہیں کہے جاؤ۔"

امیر جان کا وہ زمانہ جب معتمد الدولہ بہادر کی ملازم تھیں۔ اللہ رے ٹھاٹ کے ٹھاٹھ۔ وہ اٹھتی ہوئی جوانی ؎

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت
بھولی بھولی وہ موہنی صورت
بانکی بانکی ادائیں ہوش ربا
ترچھی ترچھی نگاہیں قہر خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک ہاتھ پاؤں

رسوا : "اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے۔ انگلی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت ہوگئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔"

امراؤ ۔ "کہاں دیکھا تھا؟"

رسوا ۔ "انہی کے گھر میں دیکھا تھا۔ ان کے کمرے کے سامنے شاہ صاحب جبہ گیروے پہنے نکلتا۔ ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے ادھر سے جو نکلتا تھا اس کو سلام کر لیتے تھے کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے:"

امراؤ : "سمجھ گئی۔ وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔"

رسوا ۔ "جی ہاں۔ کیا میں نہیں جانتا۔"

امراؤ ۔ "اچھا! تو آپ وہیں رہتے ہیں؟"

رسوا ۔ "ان کی مصاحبت میں ہوں۔"

امراؤ ۔ "اور ان کا حال کیا ہے؟"

رسوا ۔ "وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں۔"

امراؤ ۔ "کون حکیم صاحب؟"

رسوا ۔ آپ نہیں جانتیں۔ نام بھی بتا دوں گا۔ تب بھی آپ نہ سمجھیں گی۔ پھر کیا فائدہ۔"

امراؤ ۔ "خیر کچھ بتا دیجئے۔ میں سمجھ جاؤں گی۔"

رسوا ۔ "وہ نتھا ص . . . . . ."

امراؤ ۔ "خوب جانتی ہوں میں بھی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے۔ چار چار مریاں ساتھ ایک گرگابی لیے ہے۔ ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک لٹیا ہے۔ ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔" امیر جان گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں۔ خود گانا وانا جانتی نہیں تھیں۔ مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔

گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی رنگ تو کسی قدر سانولا تھا۔ مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی شرارت کوئی بات....

رسوا : "کیوں نہ ہو کس ماں کا بیٹا تھا۔"

امراؤ : "آہا۔ تو کیا آپ نے بنو کو دیکھا تھا؟"

رسوا ۔ "(مسکراتے ہوئے)" جی ہاں آپ بھی قیاس کر لیجئے۔"

امراؤ ۔ مرزا صاحب! آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں۔

رسوا ۔ خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا۔

امراؤ۔ تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگزشت کو آگ لگائیے۔

رسوا۔ مذاق کے لیے شب بھر باقی ہے۔ آپ اپنا قصہ کہیے۔

امراؤ۔ دیکھیے دوسری ہوئی۔ اچھا سنیے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے کہیں کھسک جائے اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے۔ اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔ پھر ایک کمرہ ہے اور ہم ہیں آج امیرجان کے پاس۔ کل جعفری کے کمرے میں پرسوں بسمٖ کے یہاں۔ پھر جہاں جاؤ۔ خاطر مدارات میوہ، مٹھائیاں، حقہ پان۔

رسوا۔ آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟

امراؤ۔ جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوکس ہوئی تھی۔ شوقیہ پیتی تھی۔ پھر تو تھوڑی لت ہوگئی۔

رسوا۔ گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں۔ آپ نے اس میں بھی ان کی ہوکس کی ہو۔

امراؤ۔ خدا نے اس سے آج تک تو بچایا۔ مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔ وہ بھی اب شروع کی ہے۔ کربلائے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی تھی۔ ہر دن زکام رہتا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ افیون کھاؤ۔ کھانے لگی۔

رسوا۔ اور وہ چیز نزلے کی روکنے والی۔

امراؤ۔ اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا۔ کیا تائب ہوگئیں؟۔

امراؤ۔ مدت سے۔

رسوا۔ واقعی کم بخت کیا بُری چیز ہے۔ اپنا تو یہ حال ہے۔

؎ بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ۔ ہائے کیا شعر کہا ہے۔ مرزا صاحب۔ قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں۔ پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا۔ آپ بھی غضب کیجیے گا۔

امراؤ۔ توبہ۔

رسوا۔ توبہ۔

؎ ابر بھی ہے ہوائے سرد بھی ہے
پھر وہ یادش بخیر یاد آئی

امراؤ۔ لے بس اب طبیعت کو روکیے۔ جماہیاں آنے لگیں۔ للہ اس ذکر کو جانے دیجیے۔

رسوا۔ جانے دیجیے۔

امراؤ۔ مذاق سے بھی معاف رکھیے۔

؎ اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا۔ واللہ۔ امراؤ جان کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ۔ تسلیم۔

؎ دیکھ کر مشہد ادا ان کو
لالہ و گل کی سیر یاد آئی

رسوا۔ "ماشاء اللہ۔ طبیعت زوروں پر ہے کیوں نہ ہو عالم شباب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔"

امراؤ۔ جی نہیں۔ شراب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔

؎ زاہد آج ہم کو پھر وہ مئے
جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی

رسوا۔ آہاہا۔ کیا قافیہ نکالا ہے اور کہا بھی خوب۔

؎ کعبے سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ
پھر وہی راہِ دیر یاد آئی

امراؤ۔ اے کیا کہنا "کعبے سے پھر کے" کیا خوب کہا ہے۔ مرزا صاحب۔ اسے مطلع نہ کر دیجیے۔

؎ پھر کے کعبہ سے سیر یاد آئی
پھر وہی راہِ دیر یاد آئی

رسوا۔ خاصہ۔

امراؤ۔ ؎ روشِ وحش و طیر یاد آئی
دشتِ وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا۔ یہ بھی مطلع بُرا نہیں ہے۔

امراؤ۔ شعر ملاحظہ۔ ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے
کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

رسوا۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دہرانا شروع کیجیے۔

؎ ہوا بھی ابر بھی گلزار بھی شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو مگر اک سادہ شباب بھی ہو

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب۔ آپ نے تو دل کو مردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب۔ اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گزرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہے۔

ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے لی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں۔ ڈوم ڈھاڑی۔ کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی تک سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حقے تقسیم کیے ہیں۔ اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ خانم کی اکلوتی لڑکی تھی۔ جو کچھ نہ ہوتا۔ کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔

بہت ہی کم سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کپا مارا بے چارے پھنس ہی تو گئے۔ پچیس تیس ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسے میں خرچ ہوئے اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوگئیں۔ دم ہوستی چاہتے تھے۔

مرزا رسوا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں۔ مگر زمانہ فاش ہوتا ہے۔

سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوشِش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنا حد سے گزر جاتی ہیں۔ سن اثر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیئے تاکہ اعتدال قائم رہے آخر رنڈیاں عورت ذات ہیں۔ ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ۔

رسوا۔ "کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابلِ سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیئے۔"

امراؤ۔ "اوئی تو کیا پڑھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی۔"

رسوا۔ "اچھا۔ اچھا تو آپ کہیئے فضول باتوں سے میرا وقت نہ ضائع کیجیے۔"

امراؤ۔ "کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجیے گا!"

رسوا۔ "اور آپ کیا سمجھی ہیں!"

امراؤ۔ "ہائے فضیحت! تو کہیئے مجھے بھی اپنی طرح رسوا کریں گے۔"

رسوا۔ "خیر اگر میرے ساتھ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں۔"

؎ رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ۔ "نوج آپ سے کوئی محبت کرے۔

؎ زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر"

رسوا۔ "کس کا شعر ہے؟"

امراؤ۔ "یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں؟"

رسوا۔ "ہاں سمجھا۔ تو پڑھیئے۔ آپ نے بھلا یہ غزل سنی ہے؟"

امراؤ۔ ؎ "جاتے ہیں پیچ کے بازارِ عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے بغیر"

رسوا۔ "اور وہ شعر یاد ہے؟ تقاضا کیے بغیر:"

امراؤ۔ ؎ "وعدہ ہوا کہ قول وہ ایسے ہیں نادہند
ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کیے بغیر"

رسوا۔ "اور کوئی شعر یاد نہیں ہے؟"

امراؤ۔ "اور تو کوئی یاد نہیں آتا!"

رسوا۔ "یہ تو بہت اچھی غزل تھی۔ دیکھنا کہیں نقل پڑی ہو تو مجھے دکھانا!"

امراؤ۔ "انہیں سے نہ منگوا لو"

رسوا۔ "خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے وہ ہرگز نہ دکھیں گے؟"

امراؤ۔ "یہ بھی کوئی بات ہے؟"

رسوا۔ "جی ہاں۔ آپ کو نہیں معلوم مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔"

امراؤ۔ "اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں جاں ایک شعر اور یاد آیا۔

؎ ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر"

اور سنیئے!۔

؎ "غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر"

رسوا۔ "میری بھی غزل اسی طرح میں تھی بگڑوا جانے کیا ہوئی صرف مقطع یاد رہ گیا تھا؟"

امراؤ۔ "مقطع پھر سنائیے کیا خوب کہا ہے!"

رسوا ؎ رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ۔ "واقعی خوب کہا ہے مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔"

رسوا۔ "تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوتے جاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میرا نام نہیں جانتے نہیں تو کیا عجب ہے۔ لوگ نام بھی بدل ڈالیں مگر میں تو خوش ہوں۔ اس لیے کہ انگریزی رسم کے موافق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل ترقی کرے گی۔ میرا نام روشن ہوگا۔

اب ٹالیے نہ جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔"

امراؤ۔ "کیا زبردستی ہے۔ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔"

رسوا۔ "بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی۔"

امراؤ۔ "آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں۔ مردوں میں واقعی مرزا صاحب شہر یا دیہات یہ رسم تو کچھ اچھی نہیں۔"

رسوا۔ "آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں، بہنیں بنی جا رہی ہیں اور یہ خوش ہیں۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھائے۔ کاش یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کی جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر بھی کیا۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجیے۔ اپنی بیتی کہیئے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔"

امراؤ۔ "آپ نہ مانیئے۔ گلا لے بیٹھے۔"

جب سے بسم اللہ کی چھتی ہوئی خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے۔ میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم جس سے میں بالکل ناواقف تھی اس کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہو گئی۔ آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں ان کی نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سجا دیئے گئے تھے نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوتے تھے۔ فرش پر ستھری چاندنی کھچی ہوئی بڑے بڑے نقشی پاندان، چنگیریں، خاصدان، اگالدان، اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے

دیواروں پر جلتی آئینے عمدہ عمدہ تصویریں، چھت چھت گیریاں لگی ہوئی۔ جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ۔ اِدھر اُدھر عمدہ ہانڈیاں سرِ شام سے وہ کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ دو مریاں، وہ دو خدمت گار، ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوبصورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے سامنے پاندان کھلا ہوا ہے۔ ایک ایک کو پان لگانے دیتی جاتی ہیں۔ چہلیں ہوتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں۔ چلتی ہیں لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہی نہیں کرتیں جو ہے انہیں کے حکم تابع ہے حکومت بھی وہ کہ زمین و آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا جان مانگے لوگ کلیجہ نکال کے دیئے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوتے ہے۔ کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی نہیں قبول ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سماتی بے پروائی یہ۔ کہ کوئی جان بھی دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے۔ مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا۔ ادھر اس کو ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجہ میں چٹکی لے لی۔ کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں۔ لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے۔ کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا۔ اور بگڑ گئیں۔ قسم کھائی اور سنبھل گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے۔ یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا۔ ادھر سب دیکھنے لگے جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے۔ اس پہ ہزارہا نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ دل میں کچھ نہیں۔ وہ بھی ہیچ یہ بھی ہیچ۔ اگر وہ اس بناوٹ اور فریب میں آگیا۔ پھر کیا تھا۔ پہلے بظاہر خود مرنے لگیں۔

؎ آج کل ان کو بہت ہے میری خاطر منظور
یا مری یا میرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں اس کے دشمن۔ اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھیں یار دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ اور بیان کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کرشمہ دیکھ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی۔ اس کو میں خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے۔ اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ اگرچہ مجھے کہتے ہوتے شرم آتی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھ ہی کو چاہیں۔ اور سب کے مرنے والے مجھ ہی پر مریں۔ وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں۔ وہ کسی پر جان دیں۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھڑی جس کی در و دیوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی۔ اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہتے تھے۔ ایک طرف کوٹھڑی میں چولہا بنا ہوا تھا۔ اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوتے تھے۔ یہیں دو بدقلعی سی پتیلیاں۔ لگن۔ توا۔ رکابیاں پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی تھی اس پر دو تین دالیں۔ نمک مصالحہ ہانڈیوں میں۔ اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں سامنے مصالحہ پیسنے کی سل، بٹہ۔ خلاصہ یہ کہ تمام کارگری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں۔ کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔ اور چکٹا ہوا۔ چھوٹا سا دیوٹ پلنگ کے پاس دھرا رہتا تھا۔ کھانا پکانے کے بعد ہی وہ چراغ اس پر رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت سی بتی پڑی ہے جو اندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اکساؤ لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھڑی کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن والی پتیلی، چپاتیاں۔ مولوی صاحب کے واسطے ڈھانپ کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا چھینکا تو چولہے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا اگر پلنگ پر اچانک کھڑی ہوتی تو سالن کی پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔

صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں اور شام سے ۹ بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور گھرکیوں کی مار۔ یہ ہمارا اخلاص پیار تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آئی تھی۔

اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھڑی سے ٹلیں۔ ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا۔ اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ ان سے اپنے آپ کو بہتر سمجھتی تھی۔ اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا۔ تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سیکڑوں سے اچھی ہو اس وقت تو اور بھی جوبن ہوگا۔

امراؤ۔ تسلیم۔ خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجئے۔ بالکل بے محل اور بے موقع ہے۔ معاف کیجئے گا۔ مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا۔ اور یہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی۔ ہائے مجھ میں کیا برائی ہے۔ جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی۔ مگر بات یہ ہے کہ آپ کی ہستی نہیں ہوئی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے۔ اس لیے کوئی آپ سے بولتا نہ ہوگا۔

امراؤ۔ شاید یہی ہوگا۔ مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی میری تو وہ مثل تھی: "بیدلی اپنے کھٹیلے میں آپ کھولتی"۔ اپنی ہمجولیوں کو دیکھ دیکھ کے جلی جاتی تھی۔ کھانا پینا حرام۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی چوٹی کا گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا۔ وہی بوا حسینی وہ بھی جب انہیں فرصت ہوئی۔ نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا اور سب رنڈیاں تو دن بھر میں تین تین جوڑے بدلتی تھیں۔ یہاں وہی آٹھویں دن پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کارچوبی جوڑے بدلتے تھے۔ یہاں وہی گجیدن کا پاجامہ ململ کا دوپٹہ بڑی بڑائی ہوئی لچکے کی پٹی دے دی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی۔ کبھی میراجان کے پاس مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزے داریوں کا خیال تھا مجھے کون بیٹھنے دیتا۔

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کس قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا، کسی کو منہ چڑا دیا۔ کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی اس وجہ سے لوگ پہرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اس کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا۔ کہیں دو نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوہ سوہن کی ٹکیا لیتا آیا۔ مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا وہ بھی میرے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے مگر اس ایک روپیہ کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے مگر وہ روپیہ کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے مگر وہ روپیہ کبھی نہ ملا تھا۔ وہ روپیہ بہت دن تک میں نے جگو رکھا۔ اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے لا کر کیا بتاؤں گی۔ رازداری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں اس تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

؎ ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کمبخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں گھٹا آسمان پر چھائی ہوتی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے، اور بادل گرج رہا ہے۔ بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا ہے، اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پہ رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گزر رہی ہے دل ہی جانتا ہے جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دلائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے۔ کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری گھگھی بندھ گئی منہ سے آواز تک نہ نکلی اور آخر کار میں بیہوش ہو گئی۔

صبح کو چور کی ڈھونڈھیا ہوئی۔ وہ کہاں سے ملتا ہے۔ خانم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا ۔ "یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہوتا تو کیوں بتاؤں؟"

امراؤ ۔ خیر اب حاشیے نہ چڑھانے سے جائیے۔"

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

رسوا ۔ "کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا۔"

امراؤ ۔ "امیدیں خاک میں مل گئیں! خانم کو آپ نہیں جانتے ایک ہی کائیاں تھیں۔ اس معاملہ کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور انتقام کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید و باید۔"

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک بدبڑ پھنس گیا۔

ان دنوں نگر آمین سے ایک صدر الصدور کے صاحبزادے طالب علم کے لیے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گھر سے خوش۔ والد مرحوم ان کے اشرفی نذرانہ کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آ کر اچھے رہے پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی۔ علم تماش بینی میں طاق اور فن بے عنبری میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہمراہ آئے تھے۔ وہ سب دکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجہ کا لقب دیا مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی۔ آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے جب گھر سے آئے تھے تو خاصی داڑھی منہ پر تھی۔ لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کتروان ہوئی۔ پھر خشخاشی اور تھوڑے دنوں کے بعد تو بالکل صفایا ہو گیا۔

داڑھی منڈنے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بنا نکل آیا۔ مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ چیچک کے داغ۔ بھدی سی ناک۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ گال پچکے ہوئے تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنگنا سا قد۔ غرضیکہ بہمہ صفت موصوف تھے مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے، ہر وقت آئینہ سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہو گئیں۔ بال بڑھائے گئے۔ گھونگھر بنایا گیا۔ نکے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی۔ اونچی چولی کا انگرکھا، ڈانٹا بڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب خانگی رنڈیوں کی دربارداری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی دوسرے لائق اسباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔ چلبلی جان سے مادر پدر ہوتا ہے، بگن مونچھیں لگاتی ہیں۔ منّا نے جوتا کھینچ مارا۔ آپ ہیں کہ بیٹھے ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر ناکاڈس کا بڑا ادب کرتے اماں جان کہتا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی۔ کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔

سر شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے ان کی ہر ایک خوبی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے۔ خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے۔ خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے اور تو جو کچھ تھا وہ تھا۔ منہ سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب بنایا تھا آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا مشاعرے میں ڈریائے گئے، آپ سے غزلیں پڑھوائی۔ تمام مشاعرہ چونک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے لوگ بناتے تھے آپ خوش ہوتے تھے۔ جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے خلل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بیچاری اس خیال سے

کہ اللہ کا پڑھنے گیا ہے مولوی بن کے آئے گا۔ یہ جو کچھ لکھ بھیجتے تھے۔ بھیج دیتی تھیں۔ لکھنے کے بے فکرے، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خورے آپ کے ہمراہ رہتے تھے انہیں لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا "نا صاحب! ابھی وہ کم سن ہے" اور ان کی التجا منت زاری۔ بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی۔ تاثیر اور عمل و اعمال کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپیہ پر توڑ ہوا۔ اس روپیہ کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے دلی جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیئے۔ بیس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے۔ آہ پانچ توڑے گنی دیئے۔ روپیہ علی الحال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے۔ پانچ سو روپیہ نذر نیاز کے نام سے لے مریں۔ خلاصہ یہ کہ میں آپ کے سر منڈھی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنؤ میں رہے۔ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے فرمائش کا ذکر نہیں جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا۔ خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ وہ مہربان، وہ خدمت گار میرے لیے خاص ملازم ہوئے، پھاٹک کے پاس والا کمرہ میرے رہنے کے لیے سج دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی شریف زادے، نوابزادے میرے پاس بھی آ کے بیٹھنے لگے۔

گلپین اول گوہر مرزا ہر زمانے میں مجھ سے برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا۔ جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنو بڑھیا ہو چکی تھیں کوئی پوچھتا نہ تھا اس لیے گوہر مرزا کے صرف خبر گیری میرے ذمہ تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا یہ ہمارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں بیمار پڑو تو دل سے ذلیل خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہے جاتے ہیں دوست آشناؤں سے تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چٹ کٹ پھلکے لاتے ہیں۔ جہاں بیاہ شادی کا ہو۔ ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کے مجرے میں انہی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کر اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے ہیں ہر سم پر آہ کہتے ہیں ہر تال پر واہ کر رہے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانے کو ملتا ہے۔ خاطر مدارات اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے انعام و اکرام ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی انہی کی بدولت ان کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ وہ تو ہم کو چاہنے لگے۔ ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں۔ نہیں معلوم آپ سے کیونکر ملتی ہوں۔ اب ان کے آنے کا وقت ہے۔ مجھے جانے دیجیے وہ تو ہمیشہ کے ہیں آپ اس طرح کیا بنائیے گا۔"

تماشبین ان سے دبتے رہتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی۔ یہ حمایت کو مستعد۔ شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماشبینوں کا ایک طرف خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے۔ رنڈی ان کو پیار کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ ان کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو روپے کے کڑے اتار کر دے دیئے۔ اور صبح کو غل مچا دیا کہ کوئی اتار کر لے گیا ایک دن بجلے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑی دے دی۔ اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کانوں سے گر گئی۔ اس طرح ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔ خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا طبیعت میں سفلہ پن تھا کسی پر بند نہ تھیں۔ اوروں کا ذکر کیا، خانم صاحبہ پچاس پچپن برس کے سن میں میر اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار جوان تھے۔ کسرتی بدن تھا۔ اچھوں اچھوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا۔ کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بچارے غریب آدمی تھے۔ نان شبینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کر دی۔ مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہ ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے۔ گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔ ایک اور مرزا صاحب کوئی ستر برس کا سن کمر جھکی ہوئی نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ خانم صاحبہ کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح و شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ افیم، گنا، ریوڑیاں ان سب کا اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ خورشید جان غمزدہ صورت بنائے بیٹھی تھیں۔

کیونکہ پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے [illegible] کہا "جاؤ چھوکریو"، نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں۔ جیسے رنڈیاں ویسے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں۔ جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی۔ ماں باپوں نے شادی ٹھہرائی آپ مانجھے کا جوڑا پہن کر مجھے دکھانے آئے میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیئے۔ ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو ۴۰ برس کا زمانہ گزرا۔ آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمہارا بھی؟ سب نے منہ جھکا لیا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

فرحت اللہ بیگ کا فن

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب مرزا فرحت اللہ بیگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تمام مزاح نگار اپنا انداز جداگانہ رکھتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا بھی ایک خاص رنگ ہے جسے عظمت اللہ بیگ نے خوش مذاقی کہہ کر یاد کیا ہے۔ خوش مذاقی یا مزاح لطیف میں قہقہہ کا موقع کم ملتا ہے۔ ہاں تبسم کے مواقع بہت ملتے ہیں۔ ان سب سے زیادہ ان کے یہاں ایک طرح کا انبساط حاصل ہوتا ہے جو دیرپا کہا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی علمی اور ادبی رنگ کی شوخی سے انہیں مزاح نگاروں میں ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ خالص مزاحیہ مضامین کے علاوہ انہوں نے ادبی مباحث پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن طبیعت

کی شگفتگی اور مزاج کی شوخی نے وہاں بھی گل کھلائے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے یہاں سوقیانہ پن نام کو بھی نہیں ملتا ہے۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایک طرح کی ذہنی ورزش ہوجاتی ہے جس کے بعد فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح قوت بیان پر پورا اور دا جبو دحاصل ہے تفصیلات سے مضمون بے حد دلچسپ ہوجاتا ہے۔ مرزا صاحب کی لطیف اور پر معنی تحریر تفصیل کے موقع پر بھی اپنی لطافت کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ان کی لطیفہ پسند طبیعت، ان کی رنگین بیانی، مضمون کے بیچ میں وہ واقعات لاتی ہے جو لطف پیدا کرنے کے ساتھ مفہوم کو بھی واضح کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ کبھی کبھی خفیف سا طنز بھی نظر آتا ہے جو سمجھنے والوں کے لیے کافی اثر رکھتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں دلچسپی کے کئی سامان ہیں۔ ان کی مزاح نگاری سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی دلی کی زبان اور محاورات کا کیف باقی رہ جاتا ہے وہ اکثر ایسے الفاظ اور محاورے اپنی عبارت میں لاتے ہیں جو دلی کے لوگ صرف گفتگو میں استعمال کرتے ہیں لیکن مرزا صاحب انہی سے بلا تکلف اپنے مضمون کو سجاتے ہیں اور توازن میں کوئی فرق نہیں ہونے پاتا بلکہ مکالمہ کا پورا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ روانی، الفاظ کی خوبصورت نشست، مضمون اور خیال کا دست و گریباں ہونا فرحت اللہ بیگ کی خصوصیات ہیں۔

اب ہم ان کے دو شہرہ آفاق مضامین کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

ہم اور ہمارا امتحان

جناب ایڈیٹر صاحب اسلام علیکم۔ ذوق مرحوم فرما گئے ہیں۔ ــــ
اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

بعض انسان دنیا کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور بعض روشن پہلو کو۔ ایک ہی چیز ایک کو بری لگتی ہے اور دوسرے کو اچھی۔ امتحان ایک کے لیے آفت جان ہوتا ہے اور دوسرے کے لیے دلفریب انہی دو رخوں کو دو صاحبوں نے اپنی اپنی سرگزشت میں دکھایا ہے اس کے روشن رخ کا کچھ حصہ رسالہ افادہ میں چھپا تھا۔ مگر وہ رسالے کے حق میں غالب کا قصیدہ ہوگیا۔ اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی رسالہ افادہ کا خاتمہ بالخیر ہوگیا۔

اب یہ دونوں رخ رسالہ نمائش کے لیے بھیجتا ہوں۔ دونوں کو ایک ہی پرچہ میں چھاپ دیجیے۔ جو ایڈیٹر صاحب اپنے رسالہ کی بنیاد کو بہت قوی سمجھتے ہیں۔ ان کو بھیج دوں گا۔ دیکھوں وہ بھی اس کی ٹکر کی تاب لاتے ہیں یا نہیں۔

والسلام

تصویر کا ایک رُخ

نہ ہوئی گر میرے پرچوں سے تسلی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں۔ لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے آخر امتحان ایسا کیا ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں۔ فیل یا پاس۔ اس سال کامیاب نہ ہوئے تو آئندہ سال سہی۔ میں اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو دیکھتا ہوں کہ جوں جوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس پراگندہ۔ ان کا دماغ مختل اور ان کی صورت اتنی سی نکل آتی تھی۔ بند و اور گاہ پر امتحان کا ذرہ برابر اثر پہلے تھا اور نہ اب ہے گو امتحان سے فارغ ہو چکا ہوں لیکن اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے۔ امیدوار ماں کا مجمع نئی نئی صورتیں عجیب عجیب خیالات یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوتے جائیں۔ لیکن پڑھنے اور یاد کرنے کی شرط اٹھا دی جائے۔ میری سنیے کہ دو سال میں لا کلاس کا کورس ختم کیا۔ مگر کس طرح؟ شام کو یاروں کے ساتھ ٹہلنے نکلتا۔ واپسی کے وقت لا کلاس میں بھی جھانک آتا۔ منشی صاحب دوست تھے۔ اور لیکچرار صاحب پڑھانے میں مستغرق حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ لا کلاس میں شریک ہونے سے میرے کسی مشغلہ میں فرق آسکتا ہے۔ والد صاحب قبلہ خوش تھے کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا ہے کسی زمانہ میں بڑے بڑے وکیلوں کے کان کترے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس کے لیے کوئی محنت کے لیے کہہ نہیں سکتا بعد میں دیکھئے کون جیتا ہے۔ کون مرتا ہے۔ لیکن زمانہ آنکھیں بند کیے گزر جاتا ہے۔ دو سال ایسے گزر گئے جیسے ہوا۔ لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا۔ والدین امتحان وکالت کی تیاری کے لیے مصر ہو گئے۔ مگر میں بھی ذات شریف آدمی ہوں ایک بڑھیا اور ایک بڈھے کو دھوکا دینا کیا بڑی بات ہے میں نے تقاضا کیا کہ علیحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چند روز اس حیلے سے ٹال دیئے لیکن تابکے۔ بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال چلا۔ دروازوں میں شیشے تھے۔ ان پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سے سوجاتا اور صبح نو بجے اٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھیں کھل گئیں تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے۔ اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا تو کہہ دیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ مجھے کوئی دق نہ کرے۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ لیمپ بھڑک کر چمنی سیاہ ہو گئی۔ اور میری زیادہ محویت و محنت کا نتیجہ سمجھی گئی۔ بعض وقت والد والدہ کہتے تھے کہ اتنی محنت دکیا کرو۔ لیکن میں زمانہ کی ترقی کا نقشہ کھینچ کر ان کا دل خوش کر دیا کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل بھی آسان ہوگئی اور امتحان کا زمانہ قریب آیا میں نے گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لیے جیسا چاہیئے ویسا تیار نہیں ہوں۔ لیکن میری مسلسل حاضری لا کلاس اور شبانہ روز کی محنت نے ان کے دلوں میں سکہ بٹھا رکھا تھا۔ وہ کب ماننے والے تھے لیکن پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لیے ان سے کہہ دیا کہ اگر میں فیل ہو جاؤں تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ کیونکہ میں ابھی اپنے آپ کو امتحان کے قابل نہیں پاتا لیکن والد صاحب مسکرا کر بولے کہ امتحان سے کیوں ڈرتے جاتے ہو۔ جب محنت کی ہے تو شریک بھی ہو جاؤ۔ کامیابی و ناکامی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پر ایک چھوٹا سا لیکچر دے کر ثابت کر دیا کہ ہم پال ٹکٹ لیے ہوئے مقام امتحان پر پہنچ ہی گئے۔ گویا نہیں کیا تھا۔ لیکن دو وجہ سے کامیابی کی امید تھی۔ "اول تو امداد غیبی" "دوسرے پرچوں کی الٹ پھیر" شاید وہ حضرات جو امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ اس مضمون کو نہ سمجھیں۔ اس لیے ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں۔ "امداد غیبی" سے مراد امیدواران امتحان کی اصطلاح میں وہ مدد ہے جو ایک دوسرے سے یا کسی نیک ذات نگران کار سے یا عندالموقع کتاب سے پہنچ جاتی ہے۔ پرچوں کی الٹ پھیر گو بظاہر مشکل ہوتی ہے لیکن تقدیر سب کچھ آسان کر دیتی ہے بعض شریف کم حیثیت ملازم ایسے بھی نکل آتے ہیں جو امید انعام پرچہ بدل دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن تقدیر و تدبیر کا مسئلہ جیسا اس کارروائی میں حل ہوتا ہے۔ دوسری کسی دوسری صورت میں حل نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں۔ لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں۔ اس لیے ان پر بھروسہ کرنا نادانی ہے۔ خیر آمدم برسر مطلب! پونے دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ کہہ کر کمرہ امتحان میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک بہت خلیق اور ہنس مکھ نگران کار تھے۔ مجھے جگہ نہیں ملتی تھی۔ میں نے ان سے کہا وہ میرے ساتھ ہو لیے۔ جگہ بتائی اور بڑی دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ میں سمجھا چلو بیڑا پار ہے۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

ٹھیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا۔ میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جب میرے چہرے پر اطمینان تھا۔ شاید ہی کسی کے چہرے پر ہوگا۔ خود تو اس پرچہ کے متعلق اندازہ نہ کر سکا۔ لیکن نگران کار صاحب کو یہ کہتے ہوئے ضرور سنا کہ پرچہ مشکل ہے۔ میں کئی مرتبہ اوّل سے آخر تک اس کو پرچہ کو پڑھ گیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ کس مضمون کا ہے۔ وہ مسکرائے اور زبان سے کچھ نہ بولے مگر پرچہ کے عنوان پر انگلی رکھ دی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اصول قانون کا پرچہ ہے۔ دل کھل گیا۔ اب کیا تھا۔ میں نے بھی قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اصول کے لیے کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ایک مقنن ایک اصول قائم کرتا ہے۔ دوسرا اس کو توڑ دیتا۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز پر پابند کریں۔ میں نے اپنے برابر والے سے پوچھنے کی کوشش بھی کی۔ کچھ ادھر ادھر نگاہ بھی دوڑائی۔ مگر گارڈ صاحب میری حالت تاڑ گئے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر کھڑے رہتے تھے۔ ذرا میں نے ادھر ادھر نظر پھیری۔ اور انہوں نے آواز دی کہ جناب اپنے پرچہ پر نظر رکھیے۔

جناب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہو گئی۔ تو میں نے دل میں سوچا کہ چلو ان گارڈ صاحب ہی سے پوچھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے میں نے دریافت کیا کہ جناب اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے۔ وہ مسکرائے اور کہا "مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں۔ ان سے پوچھ دیجئے۔ اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے۔ تو ادھر ذرا ٹہلتے ہوئے تشریف لے جائیے میں خود پوچھ لوں گا۔ مگر وہ کب ٹلنے والے تھے۔ قطب ہو گئے۔ ان کا مسکرانا پہلے تو اچھا معلوم ہوتا تھا لیکن پھر آخر میں تو زہر ہو گیا۔ میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو انہی صاحب سے ہوئی ہے۔ ان کا وہ مسکراتے ہوئے کہنا مجھے ایسے بُرا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اگر میرے برابر کھڑے ہو کر مسکرائے تو ضرور دست و گریبان ہو جاؤں۔ لیکن پھر سوچا کہ سرکاری معاملہ ہے کہیں امتحان چھوڑ کر کچہری میں نہ پڑ جاؤں۔ اسی لیے چپکا ہو رہا۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان کے گزر گئے۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ ایسی حالت میں کہ حرف بھی یاد نہ ہو۔ پورے چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے میں تو ہر روز آدھ گھنٹہ کے بعد ہی کمرے سے باہر نکل آتا لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ والد صاحب روز گیارہ بجے سے آ جاتے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے۔ اب میں جلدی باہر آ جاتا۔ تو جو رعب میں نے دو سال کے عرصہ میں قائم کیا تھا۔ وہ سب ہوا ہو جاتا۔ اسی لیے قہر درویش برجان درویش آخر وقت تک کمرہ امتحان میں بیٹھا رہتا اور جب نیچے اترتا تو والد صاحب سے پرچے کی سختی کی ضرور شکایت کرتا۔ وہ بھی میری تسلی کے لیے ممتحن کو بہت کچھ برا بھلا کہتا۔ لیکن ان کو یہ خیال ہو گیا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا بیٹا کامیاب ضرور ہوگا۔ امتحان ختم ہوا۔ اور امید نہ ایک اور دو کا خون ہو گیا اب ممتحنوں کے پاس کوشش کی سوجھی والد صاحب ایک زبردست چٹھی سفارش کی لے کر ایک صاحب کے یہاں پہنچے وہ چٹھی دیکھ کر بہت اخلاق سے ملے اور آنے کی وجہ دریافت کی والد صاحب نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس سال امتحان میں شریک ہوا ہے۔ اگر آپ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ زاد ہمیشہ کے لیے ممنون احسان رہے گا۔ وہ بہت ہنسے اور دوسرے لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے فرمانے لگے۔ یہ عجیب درخواست ہے کہ ان کا بیٹا تو امتحان دے اور میں کوشش کروں۔ بندہ خدا اپنے بیٹے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے۔ بیچارے بڑے میاں ایسے نادم ہوئے کہ پھر کسی کے پاس نہ گئے کچھ عرصہ بعد نتیجہ بھی شائع ہو گیا اور کمترین جملہ مضامین بدرجہ اعلیٰ فیل ہوا۔ خبر نہیں کہ وہ کون سے بھلے مانس ممتحن تھے کہ انہوں نے دو نمبر بھی دے دیے۔ باقی سب نے تو صفر پر ہی ٹالا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا۔ نمبروں کی نقل حاصل کی۔ اور بالآخر یہی رائے قرار پائی کہ کسی بدمعاش چپراسی نے پرچے بدل دیے ورنہ ممکن تھا کہ برابر تین گھنٹے لکھا جاتا اور صفر ملتا۔ مجھے بھی تعجب تھا کیونکہ میں نے پرچے کچھ اتنے برے نہ کیے تھے۔ فیصلہ کے دو پرچوں کے جوابات تو مجھے کچھ یاد ہیں وہ ناظرین کے سامنے پیش کر کے ان سے انصاف کا طالب ہوں۔ بقیہ پرچوں کے متعلق تو مجھے خود کچھ یاد نہیں رہا کہ سوال کیا تھا اور میں نے جواب کیا لکھا۔ لیکن میرے فیصلے سے دوسرے جوابات کا اندازہ ہو جائے گا۔ فیصلہ دیوانی میں یہ مقدمہ دیا گیا تھا کہ ایک مکان گروی ہے۔ مرتہن کہتا ہے کہ مرتہن کا قبضہ غاصبانہ ہے دونوں طرف سے شہادت پیش ہوئی ہے۔ مرتہن کے گواہوں کے بیانات سے میری رائے میں رہن بالکل ثابت تھا۔ اور راہن کی شہادت سے قبضہ غاصبانہ۔ میں نے اس کا تصفیہ یہ کیا کہ مکان منہدم کر کے اور زمین اور ملبہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے پیچیدہ بیانات سے پڑی ہے اس لیے مکان کے منہدم کرنے اور مقدمہ کا خرچہ ان سے دلایا جائے۔ اب بھی میں نہایت غرور سے کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ صاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ نہ مرتہن کو شکایت کہ میرا مقدمہ خارج ہوا۔ اور نہ راہن کو شکایت کہ اس کا مکان مفت میں دوسرے کو دے دیا گیا اب اس فیصلہ پر بھی اگر ممتحن صاحب نمبر نہ دیں تو وہ جانیں اور ان کا دین ایمان جانے۔

فوجداری مقدمہ کی یہ صورت تھی کہ ایک جوان عورت کے خاوند کو ملزم نے مار ڈالا تھا۔ بیچاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں دو گواہ پیش ہوئے انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے ملزم کو قتل کرتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ایک بیان کرتا ہے کہ اس کا منہ شمال کی طرف تھا۔ دوسرا کہتا ہے میرا منہ جنوب کی طرف تھا۔ ذرا انصاف کیجئے کہ جب یہ صورت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ان دونوں کی پیٹھ ملزم اور مقتول کی طرف تھی۔ اوّل تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا بڑا واقعہ ہو رہا ہو اور یہ لوگ پیٹھ پھیرے کھڑے رہیں۔ دوسرے جب یہ پیٹھ پھیر کر کھڑے تھے تو کیا ان کی پیٹھ پر آنکھیں تھیں جو انہوں نے اس واقعہ کو دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ تجویز کی کہ ان دونوں گواہوں کو دو سال قید بامشقت اور سو روپیہ جرمانہ کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا جائے اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بیچاری مستغیثہ بیوہ ہو گئی اسی لیے اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ سرکاری طور پر مستغیثہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے اور جو رقم جرمانہ گواہوں سے وصول ہو۔ وہ اس نکاح میں صرف کی جائے۔ اب رہے بچے تو ان کے متعلق یہ تجویز کی گئی کہ ملزم کو ان کے دیکھنے اور پرورش کرنے میں تامل ہوگا۔ اس لیے وہ دونوں یتیم خانہ میں بھیج دیے جائیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ اس سے زیادہ اور کیا انصاف ہو سکتا ہے اس پر بھی اگر ممتحن صاحب مجھ کو فیل کر دیں تو اس کو ظلم نہ کہیں تو اور کیا کہیں گے۔ انصاف اے ناظرین

کے ہاتھ میں ہے۔ جب تنے یہ جوابات والد صاحب کو بھی سنائے انہوں نے بہت تعریف کی ممتحنوں کو بہت برا بھلا کہا۔ بیوی بہت اشک شوئی کی۔ اور فرمایا بیٹا کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ اس سال نہیں آئندہ سال سہی۔ آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا خیر

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت
و کچھ ہوا سو ہوا ایک سال کی فرصت تو مل گئی

تصویر کا دوسرا رُخ

بہ لفظ عرب امتحان بود لیکن   کہ بندہ را بہ بلا امتحان کند واللہ

بھئی امتحان بڑی سخت چیز ہے۔ خدا کسی کو امتحان میں نہ ڈالے میرا تو یہ حال ہے کہ جب امتحان کا خیال آجاتا ہے تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو مصیبتیں مجھ پر اس امتحان میں گزریں۔ وہ سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ میرا دل اپنے امتحان کے واقعات لکھتے ہوئے کانپتا ہے۔ مگر چند محبوں اور محسنوں کا اصرار ہے۔ اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

کسی زمانہ میں ہم لوگ بھی بڑے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن زمانہ کی گردش نے رفتہ رفتہ اچھی طرح پیس دیا اور ایک وہ زمانہ آگیا کہ ہمارے رشتہ دار بھی تعلق ظاہر کرنے میں اجتناب کرنے لگے۔ والد صاحب قبلہ مرحوم کے زمانہ میں کسی نہ کسی طرح گزر ہے جاتی تھی لیکن مرحوم کی فراخ دستی اور اثاثہ کی کمی نے افلاس کی آخری حد تک ہم کو پہنچا دیا تھا ان کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی سترہ سال کی تھی انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ لا کلاس کا پہلا سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ یکایک انفلوئنزا میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تمام گھر بیمار پڑا۔ بیماری کے اخراجات نے رہا سہا اثاثہ بھی ٹھکانے لگا دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سب بیماری سے اٹھے تو رہنے کا مکان بھی فروخت کرنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر جا رہے۔ گھر میں میری والدہ صاحبہ تھیں۔ میں اور میری بہن رضیہ اس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ والدہ کے پاس کچھ سلائی کا کپڑا آجاتا۔ اس سے وہ تھوڑا بہت جو زیور رہا تھا۔ اس کو بیچ بیچ کر گزارہ کرتے جب آمدن کم اور خرچ زیادہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ تھوڑے دنوں میں جو کچھ رہا سہا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس عرصہ میں میری لا کلاس کی مدت بھی ختم ہو گئی اور امتحان کا زمانہ بھی قریب آگیا۔ اب سب سے بڑی مشکل فیس کی تھی۔ کوئی ایسی چیز بھی پاس نہ تھی کہ جسے گروی رکھ کر یا بیچ کر یہ رقم ادا کی جائے۔ کوئی ایسا محبت والا رشتہ دار نہ تھا کہ صرف ہمدردی پر ساٹھ روپے کی رقم دیتا۔ رضیہ کے پاس گلے کا ایک لچھا اور پاؤں میں پازیب رہ گئی تھی والدہ صاحبہ نے کہا۔ اس کو فروخت کر کے کام چلاؤ۔ اگر خدا نے کی تو شاید اس امتحان کے بعد ہمارے دن پھریں۔ میری ہمت گوارا نہ کرتی تھی کہ اس معصوم کا زیور لوں۔ لیکن کیا کیا جاتا اور کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہ تھا۔ والدہ صاحبہ رضیہ کا زیور اتارنے لگیں۔ وہ تو مچل گئی۔ انہوں نے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھو بھائی جان پاس ہو جائیں گے تو تم کو اتنا زیور بنا دیں گے۔ تمہارے لیے گڑیاں لائیں گے۔ تم کو اچھے اچھے کپڑے سلوا دیں گے میں یہ سب سنتا رہا۔ لیکن رضیہ کے ایک فقرے نے بے تاب کر دیا کہ مجھ سے وہاں ٹھہرا نہ گیا اس کا یہ کہنا کہ اگر بھائی صاحب پاس نہ ہوئے تو میرے دل میں تیر کی طرح لگا۔ گو اماں سمجھاتی رہیں کہ نہیں بیٹے ایسی فال زبان سے نہیں نکالتے۔ وہ انشاء اللہ ضرور پاس ہوں گے۔ لیکن رضیہ کے الفاظ تیر تھے جو اپنا کام کر گئے۔ بہرحال والدہ صاحبہ نے چھنی لال مارواڑی کے پاس ساٹھ روپے میں دونوں چیزیں گروی کر دیں۔ مجھے روپے دیئے جاؤ فیس داخل کرا آؤ اور نو روپے گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیے۔ قصہ مختصر میں نے فیس داخل کرا دی۔ رات دن محنت کرتا۔ لیکن ہر وقت یہ فکر رہتی   کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے جب خیال آتا تو برا ہی خیال آتا ہے۔ بیمار بھی پڑا مگر دو چار روز میں اچھا ہو گیا۔ آخر امتحان کا دن آہی گیا۔ اماں نے کہیں سے کہیں کر کے دو دو نان پاؤ دال کو رکھ دیا تھا کہ صبح ہی صبح کھا کر چلا جاؤں گا۔ لیکن ان کو کمبخت بلی اٹھا کر لے گئی۔ صبح کو والدہ آئیں سر پکڑ کر رہ گئیں۔ گھر میں اس روز پیسہ نہ تھا۔ میں بھی اٹھا۔ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے کہا اماں آپ ناحق فکر کرتی ہیں۔ مجھے آج بھوک نہیں ہے میں یہ کہہ کر چلا گیا امتحان کے کمرہ میں اپنی جگہ تلاش کر لی۔ اور بیٹھ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بھوک کی وجہ سے چکر آنے لگے۔ اتنے میں پرچے تقسیم ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے بھی ملا۔ میں نے دیکھا۔ لیکن ایک حرف سمجھ میں نہ آیا۔ ساتھ ہی سر میں چکر آیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا میں نے میز پر سر رکھ دیا۔ اس غفلت میں یہ نظر آیا کہ والدہ صاحبہ رضیہ کے زیور اتار رہی ہیں وہ مچل رہی ہے یہ اس کو سمجھا رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ بیٹا تیرے بھائی پاس ہو جائیں گے۔ تجھ کو یہ لا کر دیں گے۔ وہ لا کر دیں گے۔ رضیہ نے میری طرف غور سے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ اور جو یہ پاس نہیں ہوئے تو۔ میں سلسلہ خیالات میں یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی نے آواز دی "جناب یہ امتحان کا کمرہ ہے سونے کی جگہ نہیں ہے"۔ آپ امتحان دینے آئے ہیں یا سونے آئے ہیں۔ میں کھڑا ہو کر کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ انہوں نے دوڑ کر مجھے سنبھالا اور چپراسی کو آواز دی کہ پانی لاؤ۔ پانی آیا تو مجھے پلایا۔ اس وقت میرے حواس کچھ درست ہوئے پرچہ کی طرف دیکھا اس کے ساتھ رضیہ کا فقرہ یاد آیا اور جو یہ پاس نہ ہوئے تو اس کا یاد آنا تھا کہ گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور ساتھ ہی کمرہ بالکل تاریک ہونے لگا۔ مگر انکار یہ کیفیت برابر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے کچھ سوچ کر میری طرف بڑھے اور کہا بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہوشیار بھی ہیں اور ذہین بھی اور محنت بھی کی ہے لیکن آپ کی اس حالت کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی کیا آپ بیمار ہیں میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کیا آج آپ بھوکے تو نہیں۔ یہ الفاظ سننے تھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے میں چپکا ہو گیا۔ انہوں نے پھر وہی سوال کیا۔ میں نے کہا جی ہاں میں آج کھانا کھا کر نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کیوں پہلے تو میں خاموش رہا۔ جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے بہت نیچی آواز میں کہا کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کیا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ میں نے کہا جی ہاں گھر میں کچھ نہ تھا۔ میں نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور چہرہ پر ایک برقی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے اس وقت چپراسی کو آواز دی کہ تم نیچے ہوٹل سے جا کر ایک پیالی چائے اور تھوڑے سے بسکٹ اور دو تین سموسے لے آؤ۔ یہ کہہ کر وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گئے اور ان سے کچھ کہہ کر میری طرف آئے اور کہا آپ میرے ساتھ آئیے۔ پرچہ کا خیال نہ کریں۔ پہلے کچھ ناشتہ کر لیجئے بعد میں پرچہ بھی ہوتا رہے گا میں نے انکار کیا وہ زبردستی مجھ کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس لے گئے وہ قریب ہی ایک چھوٹی میز پر چائے وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔ مجھ سے کہا آپ اچھی طرح ناشتہ کر لیجئے۔ خالی پیٹ ہے پرچہ کیا خاک سمجھ میں آئے گا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے بیچاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہوگا میں نے کہا کہ سلائی کے آج کچھ پیسے آنے والے ہیں۔ خدا دن گزار دے گا۔ انہوں نے کہا۔ آج اگر پیسے نہ آئے تو

میں نے کہا ایسی حالتیں ہم غریبوں پر اکثر گزرتی ہیں۔ بہرحال چائے کی پیالی پی کر میرے اوسان درست ہوئے۔ انہوں نے اصرار کرکے دو چار بسکٹ بھی کھلائے اور کہا اب آپ اپنی جگہ پر بیٹھے۔ گھبرائیے نہیں۔ پرچہ آسان ہے۔ پرچے سے غرض رکھیے۔ گزشتہ اور آئندہ حالات کو دل سے نکال دیں۔ ان شاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے۔ پرچے کے بعد دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ میں یہ بھی دیکھ لوں گا کہ آپ نے پرچہ کیسا لکھا۔ میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھا۔ پرچہ دیکھا تو واقعی آسان تھا۔ میرے محسن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس آتے اور کہتے آپ گھبرائیے نہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے کوئی نہ کوئی صورت آپ کی بہتری کے لیے نکال دے گا۔ ایک بجے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ میں نے اور انہوں نے کھانا کھایا۔ انہوں نے پوچھا کہ کون صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کا لڑکا ہے۔ میں کچھ بولنا چاہتا تھا مگر ان کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ بہرحال میں نے دوسرا پرچہ بھی بہت اچھا کر دیا۔ اور نگران کار صاحب سے مل کر اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ والدہ صاحبہ جانماز پر بیٹھی ہیں۔ رضیہ ان کے برابر بیٹھی ہے وہ دعائیں مانگ رہی ہیں اور رضیہ آمین کہہ رہی ہے۔ پہلے تو انہوں نے میری نیک نیتی اور کامیابی کی دعا مانگی۔ اس کے بعد دعا مانگی۔ اس سے مجھے حیرت ہو گئی۔ فرمانے لگیں۔ یا الہ العالمین جس نے اس مصیبت میں ہماری خبر گیری کی ہے تو ہر مصیبت سے اس کو بچائیو۔ رضیہ نے کہا آمین۔ یا میرے پروردگار جس نے میرے بچوں کا دکھ درد سمجھا تو اس کو ہر دکھ درد سے محفوظ رکھیو۔ یا باری تعالیٰ جس نے ہم دکھیاریوں کی مدد کی۔ تو ہر حال میں اس کی مدد کیجیو۔ یا رب العالمین اپنے حبیب پاک کے صدقے سے اس کو ہر آفت سے بچا اس کی بیوی اور بچوں کو خوش و خرم رکھ اور جس طرح اس نے ہم غریبوں کے ساتھ کیا۔ اس کے ساتھ ویسا سلوک کر۔ رضیہ برابر آمین کہتی جاتی تھی جب والدہ صاحبہ دعا سے فارغ ہوئیں تو انہوں نے پیٹھ پھیری۔ مجھے کھڑا پایا فرمانے لگیں۔ کہو بیٹا پرچے کیسے کرکے آئے۔ میں نے کہا بہت اچھے۔ لیکن اگر ایک صاحب میری وقت پر مدد نہ کرتے تو خدا جانے کیسی گزرتی۔ گر پڑیں اور دیر تک رو رو کر دعائیں مانگتی رہیں۔ سجدے سے سر اٹھا کر انہوں نے جانماز کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہنے لگیں۔ ہو نہ ہو یہ بھی وہی فرشتہ رحمت ہے۔ میں نے خط دیکھا لکھا تھا جناب ہمشیرہ صاحبہ تسلیم۔ افسوس ہے آجکل ہم لوگ باہمی کچھ ایسے گرفتار ہو گئے ہیں۔ اپنے غریب اور شریف بھائی بہنوں کی خبر رکھنا اور لینا بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ آپ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد اپنے مقدور کے موافق میں آپ کی امداد نہ کروں تو باری تعالیٰ کو کیا جواب دے سکوں گا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد رضیہ کے زیور کس طرح اور کیوں گروی پڑے ہیں۔ اگر میرے بال بچے زیور پہنیں تو کس منہ سے۔

میں اس غریب نواز حضرت رسالت مآب کے سامنے جاؤں گا۔ جو کچھ اس وقت مجھ سے ہو سکا۔ وہ گزرانتا ہوں۔ قرض حسنہ سمجھ کر قبول فرمائیے۔ ماشاء اللہ آپ کا بچہ بڑا ہوشیار ہے وہ ادا کر دے گا۔ اور اگر نہ ادا کیا تو میں اسے معاف کرتا ہوں لیکن خدا کے لیے رضیہ کا دل نہ توڑیے۔ اس کا زیور منگوا دیجیے۔ کیونکہ جب تک میں یہ نہ سن لوں کہ اس کا زیور اس کو مل گیا۔ مجھے چین نہ آئے گا۔ دعا کیجیے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو ایسے غریب بہن بھائی کی مدد کی توفیق عنایت فرمائے۔"

خط کے ساتھ سو روپے کے نوٹ تھے۔ اماں فرمانے لگیں آج تین بجے کے قریب ایک چپراسی آیا تھا۔ یہ دے گیا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ کہ بیگم صاحبہ کا خط ہے ابھی کھول کر اس کو پڑھ لیں۔ مضمون سے تو سمجھ میں آتا تھا کہ میرے نام کا ہے لیکن یہ سمجھ میں کسی طرح نہ آتا تھا کہ یہ کون اللہ کا بندہ ہے۔ چلو تمہارے بتانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا میں نے کہا اماں اس طرح روپیہ لینا ٹھیک نہیں۔ بہتر ہو گا کہ کل میں لے جا کر واپس کر دوں۔ والدہ صاحبہ نے کہا کہ نہیں بیٹا! ہرگز نہیں۔ اس طرح روپیہ واپس کرنے سے ان کی توہین ہوگی۔ تم ان کا شکریہ ادا کر دو اور کہہ دو کہ بھائی یہ تمہارا قرضہ ہے۔ خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے۔ تم نے ہم بے چاروں کا وقت پر ہاتھ پکڑا۔ ہم اور ہماری اولاد تمہارے اس احسان سے کبھی بھی سبکدوش نہ ہوں گے اور ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ بھائی ہم کیا اور ہماری دعا کیا۔ لیکن اس دکھیارے دل سے مرتے دم تک جو دعا نکلے گی وہ تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے لیے ہی نکلے گی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر فرمانے لگیں۔ بیٹا جا چنی لال کو روپیہ دے کر رضیہ کا زیور لے آ تو اس معصوم کے دل سے خوش ہو کر دعا نکلے گی۔ یہ تو انشاء اللہ ہمارے محسن کا دین و دنیا دونوں میں بھلا ہو گا۔ میں چنی لال سے دونوں چیزیں چھڑا کر لایا۔ والدہ صاحبہ نے رضیہ کو پہنایا۔ وہ ایسی خوش ہوئی کہ کیا بیان کروں کہنے لگی "کیا بھائی جان پاس ہو گئے"؟ اماں نے کہا۔ انشاء اللہ اب پاس ہو جائیں گے۔ بیٹا! تم دعا مانگو کہ جس نے تمہیں یہ چیزیں واپس دلوائیں۔ خدا اس کو دونوں جہان میں جزائے خیر دے۔ غرض اماں کہتی جاتی تھیں اور رضیہ دعائیں مانگتی جاتی تھی۔ اس عرصہ میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تو دن کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ زبان یاوری نہ دیتی تھی۔ اماں نے جب میری یہ حالت دیکھی فرمانے لگیں۔ ہاں بیٹا! یہی دعا کا وقت ہے۔ اپنے اور میرے لیے کچھ نہیں۔ اپنے محسن کے لیے دعا کر خدا قبول کرے گا۔ بہرحال نماز سے فارغ ہو کر میں کتاب دیکھنے لگا۔ اور کوئی بارہ بجے سو گیا۔ صبح اٹھ کر پھر امتحان میں گیا۔ دروازہ ہی پر نگران صاحب ملے۔ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے مجھے روک دیا اور کہا میاں صاحبزادے۔ اب میں تمہارا چچا ہی ہوں۔ تم کو جب ضرورت ہو مجھ سے بے تکلف لے جانا۔ مگر یاد رکھنا کہ تم سے یہ رقم مارواڑیوں سے زیادہ سختی سے وصول کروں گا:

کھانے کے وقت پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ساتھ ہی کھانا کھلایا میں نے جو کچھ والدہ صاحبہ نے کہا تھا۔ ان سے عرض کیا کہنے لگے۔ اس ماں کی قدر کرو جو مصیبتیں اٹھا اٹھا کر تم کو پال رہی ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ آئندہ یہ تمام واقعات بھول جاؤ اور بیوی کے سامنے ماں کو کونے میں بٹھا دو۔ غرض اسی طرح وہ مجھے نصیحتیں کرتے رہے۔ آج کے پرچے بھی میں نے بہت اچھے کیے۔ اور خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا۔ اب نتیجہ کے انتظار میں ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر ایک دن معلوم ہوا کہ ہفتہ کے دو بجے نتیجہ شائع ہو گا۔ میں بھی بحالت امید و بیم پہنچا دیکھا کہ نوٹس بورڈ پر نتیجہ لگا ہوا ہے اور سامنے سیکڑوں امیدوار کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی گھس گھسا کر نتیجہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن میرے نام کا نمبر نہیں۔ کئی دفعہ دیکھا لیکن نام کا پتہ نہ چلا۔ آخر مایوسی کی حالت میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ پھر کر دیکھا تو وہی میرا فرشتہ رحمت ہنس کر کہنے لگے۔ کہو پاس ہو گئے؟ میں نے کہا نہیں! انہوں نے نوٹس بورڈ جا کر دیکھا اور میرے پاس آ کر کہنے لگے۔ ارے میاں تمہارا نام تو سب سے اوّل تھا۔ کسی دل جلے نے اوپر کا حصہ پھاڑ دیا ہے۔

مجھے یقین نہ آیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رجسٹرار صاحب کے پاس لے گئے اور انہی رجسٹر

میرے سامنے رکھ کر کہا کہ لو دیکھو اور اطمینان کر لو۔ مگر میاں ہم مٹھائی ضرور کھائیں گے یہ نہ ہو کہ پاس ہونے کے بعد ہم کو سوکھا ہی ٹال دو۔ رجسٹرار صاحب نے بھی مبارکباد دی اور میرے پرچوں کی بہت تعریف کرتے رہے بخیر میں خوشی خوشی گھر پہنچا۔ والدہ صاحبہ سے جا کر کہا وہ بڑی دیر تک مجھے گلے سے لگا کر روتی رہیں۔ اتنے میں کسی نے آکر کہا کہ ایک زنانہ گاڑی دروازہ پر کھڑی ہے۔ باہر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے محسن کی بیوی میری والدہ کو مبارکباد دینے کے لیے آئی ہیں۔ بخیر ان کو اتروا کر میں تو باہر چلا گیا۔ دو ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ تشریف لے گئیں اور میری والدہ سے کہہ گئیں۔ کل آپ کی آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادی کی ہمارے ہاں دعوت ہے۔ گاڑی آئے گی آپ ضرور آئیے۔ دوسرے روز سہ پہر کو گاڑی آئی اور ہم لوگ سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ جا کر دیکھتا ہوں کہ بیسیوں گاڑیاں اور موٹریں دروازہ پر کھڑی ہیں اور ایک بڑے ایٹ ہوم کا انتظام ہے۔ شہر کے اکثر عہدہ دار اور بڑے بڑے وکیل جمع ہیں میرے محسن نے میرا تعارف سب سے کرایا ہر ایک سے یہی کہتے کہ میرے دوست مرحوم کا لڑکا ہے۔ تھوڑی دیر باتیں ہونے کے بعد سب لوگ میز پر گئے اور ہنسی خوشی وقت گزر گیا کھانا ختم ہونے کے بعد میرے محسن نے کہا، "مجھو" ایٹ ہوم میں کسی اسپیچ دینا کا دستور نہیں ہے لیکن خاص حالات کی وجہ سے میں اس طریقے کے خلاف کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ دعوت کے کارڈ گو میری طرف سے تقسیم ہوئے ہیں۔ لیکن اصلی داعی اس دعوت کے (میری طرف اشارہ کر کے) یہ ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اس خیال سے کہ آپ صاحبان سے ان کی پہلی ملاقات نہ تھی۔ یہ ذمہ داری میرے سر رکھی اور میں نے اس خیال سے اس کو قبول کر لیا۔ کہ اس طرح میں آپ لوگوں سے ان کا تعارف کرا سکوں گا۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ اس سال کے امتحان میں سب سے اوّل رہے ہیں اور اس بات کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہایت شریف محنتی، دیانتدار اور سمجھدار شخص ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ ابتدائے وکالت میں اگر میرے عزیز دوستوں میں سے کسی نے ان کو اپنے ساتھ لے لیا اور آپ صاحبوں نے ان کی بہبودی اور جائز رعایت کا خیال پیش نظر رکھا تو یہ ایک ہوشیار اور کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔ کیا میرے عزیز دوستوں میں سے کوئی میری اس استدعا کو قبول کریں گے؟ اس اسپیچ کے ختم ہوتے ہی شہر کے سب سے ممتاز وکیل یعنی مولوی اصغر خاں صاحب اٹھے اور کہا میرے عزیز فیاض دوست نے اس نوجوان کے تمام واقعات مجھ سے بیان کر دیے ہیں میں اپنے اس نوجوان دوست کی مدد کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں اور نہایت خوشی سے اپنے ساتھ وکالت میں شریک کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میں ان سے یہ ضرور خواہش کروں گا کہ یہ اپنے تمام واقعات بے کم و کاست چھپوا دیں۔ تاکہ ہم لوگوں کو جو روپے کو بے دریغ لٹا رہے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اشراف نوجوان بھائی اور بہنیں کس مصیبت میں ہیں اور کس طرح غربت بسا اوقات بہتے جواہر پارے کو خاک میں ملا دیتی ہے اور کس طرح ہم لوگ اپنی ہمدردی کے فرض کو بھول کر روپے کو بے محل عیش و عیاشیات اور خرافات میں تباہ کر رہے ہیں اس کے بعد میں نے کھڑے ہو کر بہت مختصر الفاظ میں وکیل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے واقعات کو طبع کرنے کا وعدہ کیا۔ اپنے محسن کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا گلا بند ہو گیا اور میں ایک حرف نہ بول سکا۔ وہ دیکھ کر وہ خود اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا اور کہا میاں صاحبزادے میری تعریف کرنے کی ضرورت نہیں اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کبھی اپنے بھائی کی بروقت مدد کی تو میں سمجھوں گا کہ احسان کا بدلہ احسان سے ہو گیا۔ جاؤ اب محنت کرو۔ عدالت کا ادب کرو۔ اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے مل جل کر کام کرو۔ اپنے موکلین کی دلجوئی کرو۔ سچ پر قائم رہو۔ خدا تم کو کامیاب کرے گا۔ اس دعوت میں جو وعدہ میں نے کیا تھا اس کی تعمیل میں میں نے یہ اپنے حالات لکھے ہیں۔ خدا کرے ان کے پڑھنے سے دوسرے سبق حاصل کریں۔ اور ہم لوگوں میں وہ اسپرٹ پیدا ہو جائے جو میرے محسن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

؁۱۲۶۱ھ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(۱)

تمہید

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم "انسان" ایک "محشر خیال" ہے۔ لیکن خیال میں حشر برپا ہونے کے لیے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی۔ جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما چلتی پھرتی تصویریں پاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر۔ مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

؎ جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا دل میں آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے اور شاہی کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی۔ اس میں قلعہ کا خرچ بھی بمشکل چلتا تھا۔ برخلاف اس کے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ پھر بھی دریائے جمنا کی چمکیلی ریت "دہلی والوں کے لیے نظر فریب رہی اور اس "اجڑے دیار" میں شعراء ہی نہیں۔ ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے ملک میں بھی ملنا دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ان کاملین فن سے بہت سے تو

ملک عدم کو سدھارے۔ جو بچے کھچے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا جن کو جہاں کچھ سہارا ملا وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رام پور آباد ہوتے اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں بہت سے اٹھ گئے بہت سے اٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا جس طرح سوداؔ، میرؔ کے۔ اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان جاتے ہوئے لحظوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا اس خیال کی تحریک مومن مرحوم کی تصویر کشی ہوتی ہے کہ اردو کے لیے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کروں۔ جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اردو کے محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت حرکات و سکنات آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے لباس اور وضع کا خیال دل میں رہے۔ تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھنا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل یورپ ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی۔ جس کے شروع میں ان کے حالات درج نہ کیے جائیں۔ اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں۔ جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبطِ تحریر میں آئی۔

یہی حالات تھے۔ جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا اور اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملین فن کے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں بہت سے ایسے مرقعے پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے۔ جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اتارے گئے ہیں اکثر و بیشتر ایسی تصاویر ہوں گی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں لیکن ہر صورت میں شہادت تائید کے مقابلے میں شہادت تردید کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعہ کے متعلق ایک بھی مخالف بات ہوئی تو اس واقعہ کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہرہ دل کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال نے دلی میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے جلد چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرہ کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا۔ گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں۔ اور

؎ ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا۔ کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پہ باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں۔ جس نے اپنے مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس وقت کے تقریباً سب بڑے بڑے شعرا کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں۔ اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے جو ان سے نہیں ہوا۔ وہ اب ہم کو دکھاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگان خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے۔ جو بزم اردو ادب میں سجانے کے قابل ہو۔ لیجئے: میں "اب مولوی کریم الدین صاحب کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے۔ وہ مجھے نہ کہئے۔ مولوی صاحب کو کہئے۔ اور خوب دل بھر کر کہیے میں خوش اور میرا خدا خوش۔ والسلام۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

تمہید

؎ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۵۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور رہے۔ ہم اچھے بھلے کھاتے پیتے لوگ تھے مولویوں کا خاندان تھا لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پلٹا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جائیداد ضبط ہو گئی۔ میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کرکے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائیدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ میں ۱۲۳۶ھ میں عین عیدالفطر کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم انہیں دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بے چین طبیعت۔ اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑا دیا۔ اس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے ملا کی دوڑ مسجد۔ میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی میں آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارہ کرتا۔ محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقہ درس میں مجھے لے جاتا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بھی اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سو روپے وظیفہ بھی مقرر ہوا اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیے حاصل کیا جاتا۔ اب اس کے ساتھ گزارہ کی بڑی فکر لگ گئی تھی۔ اس لیے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیے تھا۔ نہ چلا۔

نہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ خیال آیا کہ ایک مشاعرہ کر کے شعراء کے حالات اور ان کا کلام جمع کروں۔ ممکن ہے کہ اس طرح مطلب چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے، بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں، کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لیے شاعری کرتے ہیں۔ میں خود عالم ہوں۔ میرے باپ دادا عالم تھے۔ بھلا میں تو اس قسم کے منقولیات کی طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی۔ غریب کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں۔ عارف پر نظر پڑی ان سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنویں کے پاس ایک حویلی ہے اس کو ملاسہ بھی کہتے ہیں۔ وہاں رہتے ہیں۔ کھلتا ۳۰ سال کی عمر ہے گوری رنگت، اونچا قد اور وجاہت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ داڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے۔ ٹھوڑی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے۔ بہر حال ان کی محبت ان کی شرافت اور سب سے زیادہ ان کے رسوخ نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل کر ان کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں کی گلی میں تھا۔ واپسی میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعہ سے اطلاع کرائی انہوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے۔ صحن میں نہر ہے سامنے بڑا چبوترا ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان، مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے سامنے گاؤ تکیہ سے لگے نواب صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے تو ان کو پہچانا بھی نہیں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی کہنے لگے مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہیے آج آپ کدھر نکل آئے۔ میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کر کہا۔ میاں کریم الدین، گو بات تو اچھی سوچی ہے مگر بھئی اس کا نباہنا مشکل ہے تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے شاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں مگر یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو میں بھی کرتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھہرو حکیم صاحب کو آنے دو۔ ایک تجویز ذہن میں آئی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنا پوری ہو جائے گی اور تمہارا بھی کام نکل جائے گا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں سفید بھری ہوئی داڑھی گول چہرہ اس میں کچھ چیچک کے داغ۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں آداب بجا لایا میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب صاحب سے کہا "آپ کی تعریف کیجیے" انہوں نے کہا "یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں"۔ خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آجکل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں ان کے حلیے اور ان کے کلام کے نمونے دکھائیں مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پرانے رنگ کا مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے"۔ حکیم صاحب کہنے لگے "میاں عارف خدا کے لیے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو۔ ماشاءاللہ خود طبیعت مرض پر غالب آجائے گی۔ اور تمہیں مرض ہی کیا ہے۔ وہم ہی وہم ہے"۔ "مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کر دو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو۔ میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی۔ میں ان کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں، اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرہ کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرہ کا انتظام وہ میں خود کر لوں گا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں"۔ حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہا "عارف! تمہارے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اس سے اور بھی کروں گا۔ کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائے گی اور کچھ دنوں اس شغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے۔ بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں۔ ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے ملا دیتا ہوں۔ ان کو آج کل مشاعرہ کی لگن لگی ہوئی ہے۔ حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں مگر وہ ٹال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلیٰ میں آجائیے۔ میں چوبدار سے کہہ جاتا ہوں۔ یہ اندر پہنچا دے گا۔ آگے آپ جانیں آپ کی قسمت"۔ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی وہ آیا تو اس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی نمبر ۳ میں ایک بجے آئیں گے ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا"۔ یہ کہہ کر نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ قلعہ معلیٰ پہنچا لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوتے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا۔ دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "اجی! مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے"۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے "جہاں پناہ سے میں اجازت لے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آسکیں" خیر بیٹھئے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں۔ ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا۔ یہ کیا خبر کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہو گی۔ اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہو گا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندہ خدا کدھر لے جا رہا ہے۔ اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا اب جو موقع ملا تو کن آنکھوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے اندر آگئے۔

آخر خدا خدا کر کے چوبدار نے دیوانِ خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جا کھڑا کر دیا۔ اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے اس کے دو درجے ہیں ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم اور جو جمنا کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ دیتی کے اور خس کے پردے ڈال کر خسخانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں ان میں فوارے چلتے ہیں حمام کیا ہے ایک بہشت کا نمونہ ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کیے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینہ کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ اوّل تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا۔ دوسرے راستہ کس کو معلوم خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی۔ چوبدار نے آ کر کہا کہ "چلیے" اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی خیر کسی نہ کسی طرح الٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "آداب سے" نگاہ روبرو حضرت جہاں پناہ سلامت آداب بجا لاؤ"۔ میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دہرا ہو کر رسمات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی، نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئیں۔ لمبی گردن۔ چوکا ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک۔ بڑا دہانہ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا۔ چھدری ڈاڑھی۔ کلوں پر بہت کم تھوڑی پر ذرا زیادہ لمبی کتری ہوئی۔ ۸۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھگ ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اکا دکا سیاہ بال تھا۔ چہرہ پر جھریاں تھیں۔ لیکن باوجود پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک پاجامہ اور سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتا زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کار چوبی چار گوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین میں باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو یہی کہ وہ بڈھے تھے۔ یہ جوان ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کالونس لیے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا ان کی ڈاڑھی سفید تھی ان کی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا "اماں۔ تمہارا ہی نام کریم الدین ہے۔ تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا کہ خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔

بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آ رہا ہے۔ فرمایا، اہا! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں مگر کیا کروں زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دیں۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا۔ پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے اس لیے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں۔ کہیں خدانخواستہ اگر ردیف کلہاڑیاں ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے؟ استاد ذوق تو بیچارے بے زبان آدمی ہیں۔ مگر خدا بچائے حافظ ویران سے۔ وہ ضرور لڑیں گے اور تم جانتے ہو "اندھے کی داد نہ فریاد۔ اندھا مار بیٹھے گا" کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرہ میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔ میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں۔ مشاعرہ کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔" فرمایا تو مجھے اطمینان ہے یہ لڑکا بڑا ذہین اور ہوشیار ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خاں وہ سنبھال لے گا۔ رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دوں گا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائے گا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبلو تو آ نہیں سکتے۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا اور انشاءاللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے۔ "طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر سے آواز آئی۔ "اے ہے یہ انا بچہ کو کیا بے طرح سلا گئی ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا لو بھائی! یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرہ میں کوئی طرح ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔ میں نے عرض کی۔ پیر و مرشد تاریخ۔ فرمایا ۱۴ رجب مقرر کر دو۔ وہ بھی اچھا ہے چاندنی رات بھی ہو گی۔ آج پانچ ہے نو دن باقی ہیں اتنے دنوں میں بہت انتظام ہو سکتا ہے۔ انگریزی کی بیس جولائی پڑے گی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔ میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی۔ اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہیں بولے مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہی کا ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت شاہی۔ سچ ہے "بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے"۔ یہاں میں اتنا مزید کہوں گا کہ میرے لیے حضوری اتنی مشکل نہ تھی۔ جتنا رخصت ہو کر الٹے پاؤں چلنا ہوا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگتی تھی۔ اس لیے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ خیر بہزار مشکل اس جادۂ ادب کو طے کر کے باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا۔ ادھر چوبدار ساتھ ہوا اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے مولوی صاحب بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لیے بے چین ہو رہے تھے ان ہی کی یہ کارگزاری ہے۔ ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے بھی جا کر کہہ دو۔ وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کیے کہنے لگے چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت

لگا ڈالو۔ مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں اگر ذرہ بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی۔ تو یاد رکھو۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا جب دیکھو۔ کہ ان میں کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ کیا عجب ہے کہ میرا نام سن کر راضی ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو۔ مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے عرض کی اور میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آجاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلایا ہے تو انہی کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھنا خرچ کیا پڑتا ہے"۔ میں نے کہا مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سوا سو روپے اٹھ جائیں گے یہ سنکر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں بھی اگر بوتھ پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے" یہ سن کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے میں نے کہا نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو ایسے مشاعرے کو دور سے ہی سلام ہے۔ مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہ مشکل بھی آسان کر دے گا جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے تم بیٹھے تماشا دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں۔ رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو۔ ذرا آرام لے لو اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ ادھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً ہی مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا اس میں شرم کی کونسی بات ہے آخر میری ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو"۔ وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی صبح اٹھ کر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابل دروازہ کی طرف چلا کہ استاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے بہت چھوٹا ہے۔ چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے اور صحن اتنا چھوٹا کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانہ مکان میں راستہ جاتا ہے جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویراں بیٹھے تھے یہ اندھے ہیں اور انہی سے ہوشیار رہنے کے لیے حضرت جاناں نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوسط الاندام ہیں۔ رنگ اچھا سانولا ہے۔ چہرہ پر چیچک کے بہت داغ ہیں آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پاجامہ سفید کرتا اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوتے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویراں نے چونک کر کہا "کون ہے" میں نے کہا: "کریم الدین، استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ استاد نے اپنا نام سنکر کہا "آئیے آئیے اندر تشریف لائیے"۔ میں نے آداب کیا انہوں نے فرمایا بیٹھو بیٹھو"۔ میں حافظ ویراں کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمایئے کیسے تشریف لانا ہوا"۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ہمارے حبیب۔ تاریخ مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی ازراہ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا! میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویراں تو چراغ پا ہو گئے کہنے لگے۔ جائیے جائیے۔ کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے استاد کو فرصت نہیں ہے۔ ان مرزا نے پالک کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔ استاد نے کہا بھئی ویراں۔ تمہاری زبان نہیں رکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔ حافظ ویراں کہنے لگے۔ استاد جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے اور تو میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ آپ کو ناروا کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے ان کی سات پشت کو تو م ڈالا"۔ استاد ہنس کر فرمانے لگے: نا بھئی نا۔ تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو بھی جی چاہے کہے میاں نے تو ان سب کا جواب ایک رباعی میں دے دیا ہے۔

تو بھلا تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور خود ہی تو بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے اس کے تو بُرا مانتا ہے

میں نے عرض کی ابھی کل ہی بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرہ میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوق سے بھی کہہ دیں گے۔ وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئیں گے یہ سن کر حافظ ویراں تو ٹھنڈے پڑ گئے استاد نے فرمایا۔ ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے۔ میں نے عرض کیا اور کہا کہ حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے غزل پڑھے۔ استاد تو "بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے مگر حافظ ویراں کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ اللہ خیر کرے دیکھئے اس مشاعرہ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے شگوفے چھوڑا کرتے ہیں وہ اٹھ کے گئے میں بھی اٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم جان کی گلی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ محل سرا کا ایک راستہ مردانہ مکان میں سے بھی ہے باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھڑیاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھڑی میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی جسیم اور خوش رو آدمی ہیں۔ قد اونچا اور ہاتھ بہت چوڑا چکلا، موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چنپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ ڈاڑھی بھری ہوئی ہے مگر گھنی نہیں ہے سر منڈا ہوا اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ کی جامہ دار چغہ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی میں نے آداب کیا سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے ہیں کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشاء پردازی، جغرافیہ، تاریخ، اسلم الانساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات، اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں، چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چگی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں میں ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا انہوں نے بڑھ کر معانقہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے۔ میاں نیّر تم کس وقت آبیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر لحظہ آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔ میری طرف دیکھ کر کہا، آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں۔ میں نے کہا۔ جی ہاں۔ فرمانے لگے حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔ کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے۔ کہو میاں نیّر تم بھی چلو گے۔ نواب صاحب نے کہا۔ جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے۔ تو واللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا مرزا صاحب نے پوچھا۔ مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے۔ مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو وہ آ نکلے۔ بھئی بڑی عمر ہے۔ ابھی میں تم کو ہی پوچھ رہا تھا۔

نواب علاء الدین خاں علائی نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں۔ کوئی ۲۲، ۲۳ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی ڈاڑھی ہے لباس میں خلیفے کا تنگ مہری کا پاجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا۔ اس پر بیچ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور کہا۔ واقعی آج دیر ہو گئی ہے۔ مجھے خود خیال تھا آپ انتظار کر رہے ہوں گے میری طرف دیکھ کر کہا۔ آپ کی تعریف۔ مرزا نوشہ نے تمام قصّہ بیان کیا۔ اور کہا۔ علائی! تم کو بھی چلنا ہو گا ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا بہت خوب آپ تشریف لے جائیں گے۔ تو میں بھی حاضر ہوں۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر نواب زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ انہوں نے مردانے کا ایک حصّہ میرے لیے خالی کر دیا تھا۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا۔ اس کو جا بجا پایا۔ کپڑے اتارے اندر سے کھانا آ گیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹے ہیں۔ بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں کوئی چالیس سال کی عمر ہو گی۔ ایک برکا سفید پاجامہ سفید۔ انگرکھا، کشیدہ کام کا جبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سا صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا حکیم مومن کے پاس۔ پوچھا کیا کام ہے۔ میں نے حال بیان کیا کہنے لگے میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ حکیم آغا جان کے چھتّے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو صحن چپیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند، متخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے سرخ و سفید رنگ تھا۔ جس میں سبزی جھلکتی تھی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی لمبی پلکیں۔ کھنچی ہوئی بھنوئیں۔ لمبی ستواں ناک پتلے پتلے ہونٹ۔ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ مسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی ڈاڑھی۔ بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں۔ سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب کتر ڈالے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصّہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ کاہی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پاجامہ۔ مہری پر سے تنگ، اور اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک بر کا [illegible] جامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹا کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر بھی صرف منڈا اٹکی تھی۔ اندر سے مانگ۔ اور ماتھے کا کچھ حصّہ اور بال صاف جھلکتے تھے غرض یہ کہ نہایت خوش پوش اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے۔ تو حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ اوہو بھئی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں مولوی صہبائی نے کہا۔ یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا ہے۔ وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا۔ بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے۔ اب دلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں مفت میں واہ واہ، سبحان اللہ سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں۔

دوسرے صاحب ہیں وہ ہد ہد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اساتذہ پر حملہ کرتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں۔ اپنے نا اہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ سچ میں تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے حضرت قبلہ صہبائی کی غزل بھی آئے گی۔ فرمایا۔ ہر شخص مختار ہے۔ چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے میں تو آ نکلوں گا۔ نہ غزل بھیجوں گا۔ ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب تو ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں۔ تو

مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے۔ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اب ان کو زندگی کی امید نہیں رہی۔ اُن کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دلی کے تمام کاملینِ فن جمع ہوں وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے میں خاموش ہوا۔ تو مولوی امام بخش کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ افسوس ہے کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ میری طرف دیکھ کر کہا۔ اچھا میاں تم جاؤ۔ میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا ہے۔ تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا۔ نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا۔ تو عنایت ہوگی۔ حکیم صاحب کہنے لگے۔ میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں۔ اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے ہوئے راستے میں ان سے بھی کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے مشاعرہ کہاں ہوگا۔ اور طرح کیا ہے۔ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتا بتا دیا۔ طرح کے متعلق حضرتِ جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی۔ وہ بیان کر دی۔ کہنے لگے۔ بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو سوجھتی ہے۔ نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا۔ جس میں طرح نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا۔ کہ جھگڑے کا پہلو نہیں رہا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو۔ نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا کہ میاں کریم الدین کون ہیں کوئی کہتا کہ اس سے کیا کوئی ہوں۔ مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا گلی کے موڑ پر آیا کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزارِ آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی ڈیوڑھی تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکاچوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا، واہ میاں عارف واہ حاتم نے تو کمال کر دیا۔ کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ، واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھ کر کچھ نہیں اٹھا۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترا اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری اور چاندنی کا فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑ، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا مخمل کا کارچوبی شامیانہ، جگمگاتی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز[1] کارچوبی، گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے، فانوسوں کے کنول بھی سبز۔ چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوتے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے، اسی طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے، اس سرے سے لگا کر اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے کھنچی ہوئی تھی چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک کنج میں پانی کا انتظام تھا کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں دوسری کنج میں پان بن رہے تھے، باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دکان پر سے اٹھا لائے ہیں، حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہ پھولوں کی آ گئی تھی۔ خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الائچیاں چکنی ڈلیاں اور تخم دھنیا، مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول۔ شمعدانوں کے پیچھے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا، غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا۔ میں تو الف لیلہ کا ابو الحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی ادھر ہی کی ہو رہتی ہے[2]۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے یہ سلاطین زادے ہیں، کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعدادِ علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں، دخل فضل نام کو نہیں ہے، اصلاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں "چوہے سب سے پہلے اور ساتڑے سب سے پیچھے" انہوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے، مشاعرے میں سب سے پہلے آتے اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہ چلے جاتے یہ اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے، کہیں دو گھنٹہ

---

[1] سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

[2] بزرگوں کی زبانی دیوانِ عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے اسی بنا پر اس مشاعرہ کا انتظام کیا ہے۔

کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اٹھے۔ مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا ان بیچارے کے پاؤں میں نعوذی کا قیمتی جوتا کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں، آخر پیچھے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اس کا جوتا کیا تھا چیتھڑے تھے، انہی کو گھسیٹتے ہوئے چلے۔ نیا جوتا منزل میں دبا لیا، [illegible] ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا میاں تم نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو! آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا۔ اوّل تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ دوسرے ہر تیسرے چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا۔ مگر انہوں نے کبھی "نا" نہیں کی جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کو لیا اور پوچھا ہیں صاحب عالم! میاں حیاؔ آپ کے ساتھ نہیں آئے۔ مرزا رحیم الدین حیاؔ ان کے بڑے بیٹے ہیں۔ لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے، نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے۔ جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا، بٹیر لڑانا سکھایا اور تخت کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتے تک کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد آنا تو درکنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو تیرھویں صدی ہے۔ ان کو بنارس بھیج کر میں مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور [illegible]۔ یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رساؔ کو لیجا کر ایک جگہ بٹھا دیا ان سے فارغ نہ ہوتے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسانؔ کو جھرمٹ میں لیے آپہنچا۔ بھلا دلّی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو جگت استاد ہیں پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ مگر استاد ذوقؔ کے قلعہ میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹ گیا۔ یہ بھی زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیرؔ سے ٹکر لے چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی نوّے برس کی عمر تھی کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانہ کے ملہم شاعر تھے۔ بلکہ غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی استادی کا سکہ ایک زمانہ سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے استاد ہوئے رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نوّر اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہوئی وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے اس لیے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے، مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور ایسا ایسی ترکیب سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا۔

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

انہوں نے فوراً عرض کی

نامناسب ہے یہاں وقت سحرگاہ نہیں

کسی نے "وقت" "سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انہوں نے بھٹ صاحب کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقت سحرگاہ گراں می گردد

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا۔ شاہ نصیرؔ نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے۔

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لا کر بٹھایا ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہؔ، تم ننگے نشے میں چور جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں۔ مگر عجیب حال ہے۔ کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں۔ کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیشؔ سے صلاح لینے لگتے ہیں، کبھی استاد ذوقؔ کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں۔ شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا منشی جی کیا رنگ ہے، کہنے لگے، اصل رنگ مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟ نواب صاحب نے کہا ابھی شروع ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔ خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے ان پر ایک دوشالہ لا کر ڈال دیا۔ انہوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا ہوا تھا، جس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومنؔ خاں آئے ان کے ساتھ آزردہؔ، شیفتہؔ، صہبائیؔ اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اوّل ہیں، عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانہ میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں۔ اس لیے خود شعر نہیں کہتے۔ مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دے دینا ہے۔ کوئی ۶۰ سال کا سن ہے رہنے والے تو نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دلی میں آ رہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے مشاعروں میں کم جاتے ہیں، یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے، تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندی شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگائی ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔[2]

---

[1] آپس کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادہ کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں، اس لیے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی تاج کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

[2] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے مگر نام نہیں لکھا مجھے یہ واقعہ انہی کی زبانی معلوم ہوا۔ سن کر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے، یہ بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا فرمانے لگے۔ میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔ میں نے عرض کی۔ مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے! فرمانے لگے۔ بھئی یہ بھی اچھی ہوئی۔ وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے۔ تم کہو نواب صاحب کا ہے چلو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے۔ میر علائی۔ سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا۔ بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر خاں محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ کیوں ایسا ایک دم چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا اب یاروں کو رو کے ہیں دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے۔

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یاران وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے۔ ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا۔ حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا اے لیجئے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں۔ دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں، میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمان ہے یورپ کے رہنے والے ہیں، دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے یہاں ٹھہر گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورہ سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا انہی کی تجویز سے چگی ڈاڑھی رکھی۔ سر منڈا کر عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھئی ہو گئے۔ انہی کے ذریعہ سے دربار میں پہنچے اور طائر الاراکین شہپر الملک ہُدہُد الشعرا منقار جنگ بہادر" خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا مگر بعد میں انہوں نے استادوں پر حملے شروع کر دیئے کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارہ سے ایسا کیا۔ لیکن کچھ بھی ہو آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ ان کی مدد کر نہیں سکتے تھے۔ خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی جو قلعے والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے۔ تھوڑی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ منہ آتے تھے اسی لیے مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سن کر مرزا نوشہ مسکرائے اور کہا بھئی ہیں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگے۔ مگر آج دیکھا جائے گا"۔ "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹک گئے تو میں سمجھوں گا۔ بڑا کام کیا۔ غرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آگئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ الٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں، شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ، بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا اور اونچا چوکا۔ آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، ڈاڑھی گلوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ غرض عجیب شباہت ان لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی۔ امیر تیمور سے لے کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا۔ مگر اب دورنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب سلیمان شکوہ کا۔ اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا۔ خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں جو وہاں جا رہا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس طرح اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔

اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انہی کو دیکھ لیجئے۔ جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں ان کے سر پر دو پلڑی ٹوپی ہے۔ اونچی چولی کا انگرکھا ہے نیچے باریک شربتی ململ کا کرتا اور تنگ پاجامہ ہے۔ جنہوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا ان کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے، سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا۔ اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتان۔ پاؤں میں گلبدنی یا غلطے کا ایک برکا پاجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں انہوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے چہرے کی ساخت سے ان کو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے داہنی طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کرونگا کہ جس کو جہاں چاہے بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا۔ جہاں ان کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہئے تھا تو بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے، جہاں اس کو بٹھانا چاہتے تھوڑی دیر کے بعد کہتے۔ ارے بھئی ذرا ایک بات تو سنتا۔ وہ آکر ان کے پاس بیٹھ جاتا اس سے باتیں کرتے رہتے اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے۔ اس سے کہتے تشریف رکھیے وہ جگہ خالی ہے۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم یہاں بیٹھیں پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انہوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے صاحب عالم ادھر آئیے کسی سے کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے کہتے بیٹھو بھئی بیٹھو غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے داہنی جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور ان کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے۔ ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی چڑیاں

جہاں چاہا پکڑے لے گئے اور پدڑیاں اڑا دیں، ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ جھنڈ سے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی، انہوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اڑیں، انہوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوق کو آتے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آ پہنچے۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی، رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نراہٹ ہے بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدن کا پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال ہیں اور تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں، غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگایا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے اور ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہو گئے، چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے، سرخ شالی رومالی کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے ہوادار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا ادھر عصا بردار قرآن کے سامنے آگئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیے۔ اسی سلسلے میں یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کو سلام کیا، پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا اجازت ہے سب نے کہا بسم اللہ اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا تشریف رکھیے۔ تشریف رکھیے۔ سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ وہاں جا کر بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے۔ شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے، چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ان کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا۔ خوشنوایان چمن دہلی! میرا کیا بساط ہے، جو آپ جیسے استادان فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ صرف حضرت پیر مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ ہاں اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے، اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی دفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔ یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے انہوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبداروں نے شمعیں لے جا کر لگنوں میں رکھ دیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا انہوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باآواز کہا "حضرت مشاعرہ شروع ہوتا ہے!"

اس آواز کا سننا تھا کہ سناٹا سا ہو گیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر کے تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان اور پان و چلیے کی طشتریاں رکھ کر اپنی اپنی جگہ جا کر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواص بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے۔ وہ خود شمع کے قریب آ کر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

"حاضرین! حضرت ظل سبحانی، صاحب قران ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے، نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جائے۔" نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواص نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی۔ بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سوز کے سُروں میں پڑھنا شروع کی الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی۔ کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادان فن ہر شعر پر جھومتے تھے کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے ورنہ سارے مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا۔ اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
لگے یوں تو ہزار ہا تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دلے ناز و کرشمہ کی تیغ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

---

[1] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے۔ (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا)

[2] نواب فتح الملک بڑے پکے مسلمان تھے۔ کوئی کام فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے تھے اسی لیے سب قلعے والے ان کو "مُلّیا" کہتے تھے۔

عرض کر چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر ادھر ادھر دیکھا۔ جلدی سے اٹھ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، صاحب عالم ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف کر سکیں۔ البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر اس خاکسار کے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔ مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا۔ اس نے عرض کی قبلہ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہ والی میں پہنچا دوں گا۔ خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے کہا اور کہا جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی دیتے جاؤ۔ چلتے چلتے ہمیں عنایت کی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی۔

دل سے لطفِ مہربانی اور ہے
مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد مجنوں اور ہے
عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب ٹھہرتے ہیں اشک
بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اعدا کب ہوتے ہیں صاف
ان کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو نہایت پھسپھسی تھی۔ مگر ولیعہد بہادر کی غزل تھی بھلا کس کا جگر تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض جلنے والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا۔ مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ کب تعریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ولیعہد تو ولیعہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن اٹھا کر نہ دیکھیں۔ القصہ خواص تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں لا کر صاحب عالم کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر ادھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا بھلا ہماری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کر دیں البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بغرض اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا جو لادوا نہ ہوا
حال جس جا کہیں غیر کے سامنے
یار کر دل گیا کہ تو مرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو مشتاق رہے دل کی طرف
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
شکوۂ یار اور زبان رقیب
کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا
تم رہو اور مجھے [illegible] عیار
میرا کہنا ہے ہوا ہوا نہ ہوا
پھر تم آئے ستم اٹھانے کو
وہ مزہ دیکھا جس میں بدا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ دل کھنچا جاتا تھا سننے والے بے خود ہو جاتے تھے سبحان اللہ، ماشاء اللہ، واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے۔ مگر ان دونوں کو انہی دو شعروں کی لٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور رہ رہ کے اس پر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا سبحان اللہ، صاحب عالم سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے۔ شعر یوں کہتے ہیں۔ 'مزہ' آ گیا۔ استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اس بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا، یہ آپ حضرات کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے شاہ نشین کے سامنے سے ایک شمع اٹھا سامنے کی صف میں میاں پچی کے آگے رکھ دی۔ نام تو ان کا عبد الغفار تھا مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں پچی کہتا تھا۔ ان کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک کر آتے اور کسی کو جواب میں ان کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص پچی رکھتا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے، پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی۔

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے
ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اس دبنگ سے
لب کا یہ حال کر دیا ہے مزا خط سبز نے
ساقی نے پشت دی ہے صافی کو رنگ سے
دل اب کے بے طرح ہے پھنسا زلف یار میں
نکلے یہ کیونکر دیکھئے قید فرنگ سے
آجا تو اس کے بیچ میں ظالم کے دیکھنا
یاری تو ہم نے کی ہے اس شوخ و شنگ سے

اس کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا مرزا علی بیگ کے سامنے رکھ دی۔ یہ جیسے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے۔ نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی 'اوڑھنی لاؤ'۔ ایک نوکر فوراً الٹے سر پھرا۔ بیگم کی تاروں بھری اوڑھنی لے کر حاضر ہوا۔ نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا۔ ایک پلو کا بکل مارا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا، اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگی۔ غزل ایسی لہرا لہرا کر اور لچکا لچکا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ حضرت ایسا پیار کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا 'باجی' کو جلانے کے لیے سب کچھ کر لینے کو تیار ہیں۔ سننے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزہ آیا مگر جو سمجھنے والے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف ماجرا تیرا
کہ ہم جوروں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
مجھے کہتی ہیں باجی آ کے تو کام سے دیکھو
نہیں مجھ سے کسی میں ہمسر، بہتی کا اولاد
اگر اے نازنین تو دلی پتلی کمانی سی ہے
پھر یہ لاجلت، نام خدا ہے تیرے دوپٹا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر الٹی طرف کا۔ نازنین کے پڑھنے کے بعد داہنی جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے۔ نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد۔ شعر نہایت اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں ایک شعر ایسا نکل گیا ہے کہ سبحان اللہ لکھا ہے۔

فقط تو ہی نہ میرا اے بت خونخوار دشمن ہے
ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر حبیب اللہ خاں ادیج کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پرانے ۔ ۷۰، ۸۰ برس کے مشاق شاعر ہیں۔

مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی ان کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزہ آئے اور کوئی کیا داد دے ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں اور خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں اکثر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں۔ مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا آج بوتا ہے جو ان کو استاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انہوں نے شعر پڑھا ادھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور ان کے تیور بدلے۔ ان کے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی۔

دم کا جو دم ہے باندھے خیال اپنا
بے پل صراط اتریں، یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سرائے نفرت — سم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نال اپنا
کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل — سا انچھے یہ تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
یہ چک کے ابلوں کی ہیں باگ موڑتا ہوں — (رکھ کے) دیوی کے آستاں پر بیٹھیں ہلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اچھل پڑے، کہنے لگے، واہ میاں اور دیکھو اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا لیا ہے، بھئی واللہ "الفاظ" رکھ کے کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔ غرض سب استادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے اور میاں آدھے ہیں کہ پھول کر کپا ہوتے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی ان کی عمر ۱۵/۱۶ سال کی ہوگی۔ مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں، ناک نازک سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے یہ غزل کہی تھی۔

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا — کس دل جلے کی بار خدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہوجیو تو عاشق بے حیا — آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا — رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا — جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا استاد احسان نے کہا میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو۔ کوشش کیے جاؤ۔ ایک نہ ایک دن استاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ بے استاد رہے تو بھٹک نکلو گے۔ میاں تمکین نے مسکرا کر کہا۔ استاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں کل ہی انشاء اللہ استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ استاد ذوق نے کہا ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔ یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بھی بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے۔ مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں نصیر کے شاگرد تھے بعد میں ان سے ٹوٹ کر استاد ذوق سے آملے۔

بھاری بدن، منڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گہرا سانولا رنگ، جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پاجامہ اور سوسی ہی کا کرتہ، کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی، بیچارے پنچ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں بڑے پر گو شاعر ہیں لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لیے جو کچھ کہتے دل و دماغ میں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک امی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو استاد تلامیذ الرحمٰن کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یارب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بیکار تو اپنی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچیے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبِ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو استاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ خاں صاحب یہ میاں بجن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں سیکھنے کو تو میرے شاگرد ہیں مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی، کل ایک غزل سنائی تھی میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی ہاں میاں بجن وہ کیا شعر تھا۔ میاں بجن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل کر زبان پر آ گیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی — پہلو سے دل میں، دل سے کلیجے میں جا لگی

اور یہ شعر تھا

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا میاں بجن یہ تو خدا کی دین ہے یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی میاں خوش رہو۔ اس وقت دل خوش کر دیا۔

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی۔ یہ الٰہ باد کے رہنے والے ہیں بہت دنوں سے دلّی میں آ رہے ہیں۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دلی لگاؤ ہے کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے — توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو پرائے تابش — وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی، مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔ تابش کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں فلق کے آگے گئی، خدا ان سے محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں، عبدالعلی نام ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں کوئی ۴۰ برس کی عمر ہے بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدرآباد ہوتے ہوئے دلّی آئے۔ مرزا مغل کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بیڑا گروا دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں، شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا مالک ہے شعر خاصہ کہتے ہیں۔ لکھا تھا۔

خمِ شراب سے خمِ گردوں تو بن گیا　　ساقی بنا دے ماہ پیالہ اچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے تعلق کشی کرو　　جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج کے سامنے آگئی۔ ان کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی سی بہت تعریف ہوئی باقی کے تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اس جانِ جاں کے دیر ہے　　کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں　　موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

ان کے بعد مرزا اکمل بیگ کی باری آئی یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں اکمل تخلص کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں۔

مژگاں سے گر کے دل ابرو کے ہے ٹکڑے　　یہ بات میں نے کہہ کر جب اس کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہو گا خالی　　تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں۔ ۶۲، ۶۳ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں۔ مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں اسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں، شعر برا نہیں کہتے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اٹھے۔ اور ہر شخص کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی ان کا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ نارسی پر　　رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن　　کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم　　ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی۔ مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی اس لیے ذرا آزردہ سے ہو گئے ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں۔ اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو آخر کس کے پوتے ہیں۔

میری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم　　یہ سر پہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلی لے　　کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ مگر پڑھتے خوب ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی انہوں نے سلام کا تار باندھ دیا غزل لکھی تھی۔

بجھانا آتشِ دل کا بھی کچھ حقیقت ہے　　ذرا سا کام تجھے چشمِ تر نہیں آتا
عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملتی ہے　　گیا ادھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا
ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے　　نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

یہ آخری شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا اس کی انہوں نے بہت تعریف کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا میاں رقم یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔

شمع کا شیخ نیاز احمد ہوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوق ذرا سنبھل بیٹھے ہوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے۔ مگر مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجئے ممکن ہے کہ میں نے غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیوں کر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں　　لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں
قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ نہیں نصیب　　جس درد کا کہ چارہ نہیں چارہ گر نہیں
قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت دگرنہ ہاں　　وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں
سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی　　اے ہوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی، میں تو اب بھی یہی کہوں گا۔ کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں۔

ہوا ہے شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا　　جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا　　منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بارِ گنہ سے جھکا ہے سر　　اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا　　اس میں گلہ نہیں مجھے آشفتہ ساز کا
اور وصل کے ساتھ لطف سے تھا سوز و نیاز　　یاں بڑھ گیا دماغ تغافل نواز کا

ذرا سچ کہیے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ کیا کہنا ہے باپ کا دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا سرکار سے خطاب خانی پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا۔ آجکل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئے گا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی بڑے جلے ہوں گے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہِ شعلہ زا تپش و شرار بھی نہیں　　نُہ آسمان ہیں دو بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کس کو تاب شکوۂ دشمن کی ضعف سے　　لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جلنا فراقِ یار میں وصل کی لاگ پر　　آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں مرزا حاجی بیگ شہرت، گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بڑی پاٹ دار آواز ہے پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا جاتا ہے، ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ ہر شعر تعریف کے قابل تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن دو دن کہاں تک تو بھی کچھ انصاف کر　　یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جوہرِ قابل ہی کے شایاں کہ ہیں　　خاک کا پتلا بنا پتلے سے انسان ہو گیا

کفر دل میں تھا کچھ عقدۂ ہجر بند نقاب — اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا
پہلے دعویٰ خدائی اس بت کافر کو تھا — کچھ دلستی پہ جو آج آیا تو انساں ہو گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں۔ دونوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے — واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے۔ اعجاز ہے، یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے! ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوئے خدائی اس بت کافر کو تھا۔ کچھ دلستی پہ جو آج آیا تو انسان ہو گیا۔ غرض اس شعر نے ایک کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی۔ لوگ خود پڑھتے تھے ایک دوسرے کو سناتے اور مزے لے لے کر جھومتے اور جوش واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نواب مرزا حسین خاں تمنا کے سامنے گئی، یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۲۲، ۲۳ برس کے ہوں گے۔ بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میاں شہرت کے شعر نے وہ جوشش پیدا کر دیا تھا کہ ان کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سنی غزل بھی معمولی تھی صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔

جان کر دل میں مجھے اپنا مریض تپ غم — کہتا لوگوں سے ہے بنا برت جیا ہے کیا
رنگ رخ زرد ہے تر چشم ہے اب دم کو — پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آیا ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ متین اور وضع دار آدمی ہیں، اعلیٰ حضرت کے شاگرد ہیں، ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے۔

سبو سے منہ لگائیں گے اب اتنا صبر کس کو
کہ بھرے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انہوں نے اس روز مشاعرہ میں پڑھی تھی اس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں تو سب گوشے میں آ گئیں — اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل
جل جل کے سوخت تپش غم کے ہاتھ سے — اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا — اور دیکھئے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر، جس کا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر، وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے ان کی غزل میں زور نہ ہو گا تو اور کس کی غزل میں ہو گا۔ غزل تھی۔

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ — ناخدا ترس تو کعبہ میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سروپا ہیں وہ دشت میں عالم کے سپہر — ناز ہرگز نہ اٹھا منت ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہ ہوئی، وجہ یہی ہے کہ یہ رنگ اب دلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اس کو اب چھوڑتے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار ان کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے تھے چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے۔ اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ پھر سمجھ کر پھونک مار کر شمع گل کر دی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں مگر سب نے کہا ضرور فرمائیے۔ انہوں نے نہایت اچھی آواز لہجے میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے ایک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں ادھر کی جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی جب اثر نہ کرے اے تشنہ — فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے، ادھر یہ عالم طاری تھا، ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں"۔

مرزا فخرو نے شمع اٹھا کر روشن کی اور کہا۔ ہاں صاحب پھر فرمائیے۔ شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔ اول تو یہ نو مشق ہیں مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے اوٹ کا قرار اٹھا لیا — اس نازکی پہ بوجھ یہ کیونکر اٹھا لیا
بارگرانِ عشق فلک سے نہ اٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا
پیر مغاں نے بسمل میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہر حال کسی نے سنا اور کسی نے نہ سنا، پھر تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی عمر کوئی ۴۰ برس کی ہو گی، صہبائی کے شاگرد ہیں۔ مومن سے بھی اصلاح لی ہے ان کا خاندان دلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا، سپاہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی برا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلیِ دل — کسی کے جانے سے گو نہیں قرار مجھے
شب وصال میں تھا پڑا افسانۂ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ راز دار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرمائیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے
مرے تصور سے دیدار میں بھی تا محشر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
مزے یہ دیکھیں ہیں آغاز عشق میں تسکین — کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے۔ استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی انہوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی چشم کی، زلف دوتا کی — ہے اک دل جفا کس کس بلا کی
کب اس گل کی گلی تک جا سکے ہے — ہوا باندھی ہے یاں دل نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل — تمہیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل پھسپھسی تھی، بھلا اس کی کون تعریف کرتا، ہاں اس کے بعد وہ غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزہ آ گیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد بھی۔ بحر میں ایسی

غزل لکھنے بیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر نہاں وار جگر چاک ہوا — پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیے اُس بت کو شاپہ کس کے — دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہد پیری میں جوانی کی امنگ — آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور بیاں تاب سلام کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ جب ذرا جوشش کم ہوا تو شمع استاد ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بیچارے بوڑھے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں۔ اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ بلاں اللہ اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

استاد ذوق کے چھوڑ کر غالب، مومن، آزردہ، صہبائی، غرض جتنے استاد لوگ تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی اور انہوں نے ذوق کی طرف دیکھ کر کہا دیکھا شعر ساں کہتے ہیں، وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، ان کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا۔ مگر انہوں نے روک دیا۔

خدا خدا کرکے ان سے فراغت ہوئی اور شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزینڈر ہیڈلے ہے، قوم کے فرانسیسی ہیں، دلی میں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے، کوئی ۴۱ سال کی عمر ہے۔ ڈاکٹری بھی جانتے ہیں۔ شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آ موجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے۔ مگر بات چیت اردو میں کرتے ہیں، ایسی صاف اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ برے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم رہ معاصی ہوں جہاں میں — گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو گردشت اُڑا دی — ہاتھوں سے مرا دیکھ ذرا جیب دری کا
چلم کو عبادت کے لیے وہ سر آئے — آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا

روشن کتابیں

روشن
کِتابیں
سب
کے
لیے

ہم اِس وقت تک روشن کتابوں میں خصوصی اہمیت کی حامل کُتب آپ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں، لیکن اب خصوصی اہمیت کے ساتھ ساتھ ایک اچھوتا اور حیرت انگیز سلسلہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ پاکستان کے تاریخی اور جغرافیائی واقعات کا مرقع ایک بالکل نئے انداز میں!

پاکستان کے تیس سال

(ماہ جنوری سے ماہ دسمبر کے آئینے میں)

اِس سلسلے کی ہر ماہ ایک کتاب شائع ہو گی جس میں اُسی ماہ کے سنہ ۱۹۴۸ء سے لے کر سنہ ۱۹۷۸ء تک کے واقعات درج ہوں گے۔ اس طرح آپ بارہ اقساط میں پُورے تیس سال کے واقعات جان سکیں گے۔ اِس سلسلے کے مؤلف جناب زاہد حسین انجم ہیں۔

مطبوعات شیخ غلام علی
اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور